انکل ٹام کا دیس
طارق اسمٰعیل ساگر

پیش لفظ ۔۔

امریکہ جانے کے لئے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔۔۔ ہر وہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی حربہ استعمال کرتے ہیں جس کی مثال شاید ہمارے ہاں ہی ملتی ہے۔ لیکن یہ امریکہ ہے کیا؟ جس کے لئے ہم اپنا ضمیر اور ایمان بھی گروی رکھ دیتے ہیں۔

یہی کچھ جاننے کے لئے میں بھی امریکہ جاتا رہا ہوں۔ جہاں میں نے تصویر کا دوسرا رخ کچھ زیادہ ہی دیکھ لیا ہے۔

آپ بھی دیکھئے

امریکنوں سے خدا سمجھے!

ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔

220 کے بجائے 110 وولٹ بجلی استعمال کرتے ہیں۔

جس طرح ہم بجلی جلاتے ہیں، یہ اس طرح بجھاتے ہیں اور جس طرح ہم بجھاتے ہیں یہ اس طرح جلاتے ہیں۔

Keep To The Left بچپن سے یہی پڑھتے آرہے تھے۔

امریکہ میں پڑھا سنا غلط ثابت ہوا۔ امریکن دائیں ہاتھ چلتے ہیں۔ بائیں ہاتھ ڈرائیونگ کرتے ہیں کسی بھی پاکستانی کے لئے جو امریکہ جائے پہلا سبق یہی ہے کہ اپنے پڑھے، لکھے، کہے، سنے پر اعتماد نہ کرنا ورنہ امریکہ کم اور امریکی ہسپتال زیادہ دیکھنے پڑیں گے۔

پیدائش سے وفات تک ہمارے ہاں بھی سرٹیفکیٹ جاری ہوتے ہیں ان پر
امیدوار کی ولدیت درج ہوتی ہے۔

لیکن---

امریکنوں کے لئے "والد" کوئی مسئلہ نہیں۔

یہاں امیدوار کی والدہ کا نام درج ہوتا ہے۔

اس سے یہ ہرگز نہ جان لیجئے کہ امریکن باپ سے زیادہ ماں کی عزت کرتے ہیں
اس معاملے میں جتنی مساوات آپ کو یورپ اور امریکہ میں دیکھنے کو ملے گی شاید اور
کہیں نہ مل سکے۔

عرض کرنے سے مطلب یہ ہے کہ امریکی ماں اور باپ دونوں کی ہی عزت نہیں
کرتے یا پھر دونوں کی عزت کرتے ہیں۔ خیر ہم اس چکر میں نہیں پڑتے۔

میں تو آپ کو یہ بتانے جا رہا تھا کہ ضروری نہیں امریکن بچوں کے "والد" بھی
ہوں۔

عموماً یہ لوگ "والدہ" سے ہی کام چلا لیتے ہیں۔

کسی فرانسیسی نے امریکنوں کو طعنہ دیا تھا کہ جب امریکن فارغ ہوں اپنا باپ
تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

قیامت کے روز میدان حشر میں سب کو ماں کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ سنا تھا۔

عمل کرتے اس دنیا میں امریکیوں کو دیکھ لیا ہے۔

"حرامی بچوں" کا تناسب یہاں کیا ہے؟

اسی ایک بات سے اندازہ فرما لیجئے۔

میں امریکہ 4 مرتبہ گھوما ہوں---اور خوب گھوما ہوں

لیکن---

ایک وضاحت آغاز ہی میں کہہ دوں کہ امریکہ کو گھوڑے، گڑیا یا گدھے کی نہیں
ن اور پاکستانی کی آنکھ سے دیکھا ہے۔

لیکن!

وہ بہت کچھ ضرور دکھادوں گا جو میں نے دیکھا اور جیسا محسوس کیا۔

میں نے امریکہ میں سطح زمین پر ہی نہیں، زیر زمین بھی سفر کیا ہے۔ (مراد ہے
ب وے)

سمندروں پر چلا اور ہواؤں میں اڑا ہوں۔

یوں دیکھا ہے کہ دیکھنے کا حق ادا ہو جائے۔

لیکن کسی تعصب سے نہیں۔

کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں سے۔ یہ الگ بات کہ خطاکار ہونے کے باوجود کبھی کبھی
ں بندہ ناچیز کو بعض مناظر کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کرنا پڑیں۔

جیسے کبھی کبھی ہم اپنے ملک میں ہونے والے بعض واقعات پر، اپنے گرد اگرد
ونے والے احتجاج پر گھبرا کر اپنے کان بند کر لیا کرتے ہیں۔

ینہ امریکہ میں بسا اوقات بعض مناظر دیکھ کر آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں اور یہی نہیں
لمہ کان لپیٹ کر نکل جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

مثلاً واشنگٹن، نیویارک یا فلاڈلفیا کی کسی سٹریٹ پر اگر کوئی کالا یا گورا امریکی غنڈہ
ی کی جان لے رہا ہے۔

کسی کو لوٹ رہا ہے۔

کسی پر تشدد کر رہا ہے۔

ان واقعات پر غیرت یا طیش کھانا آپ کی صحت کے لئے اتنا نقصان دہ ثابت ہو گا
کہ پھر مدتوں آپ ناصح بنے رہیں گے۔ میرا مطلب ہے اپنے احباب کو سمجھاتے رہیں

ے کہ جو غلطی آپ نے کی ہے وہ کوئی دوسرا نہ دہرائے۔

طاہرہ کے گلے سے ایک کالے نے سونے کی چین کھینچ لی اور یہ حادثہ اس کے گھر سے بمشکل دو فرلانگ کے فاصلے پر پیش آیا۔ جہاں سے وہ ہزاروں مرتبہ گزر چکی تھی۔

یہ اس کا معمول کا راستہ تھا۔

جس کالے نے یہ حرکت کی طاہرہ اسے پہچانتی تھی۔

لیکن----

اس کے لئے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

میں نے اسے بار بار کہا کہ وہ پولیس کو اس کالے کے متعلق بتا کیوں نہیں دیتی اس کا جواب یہی تھا کہ یہاں کے حالات کو تم نہیں سمجھ سکتے۔

دراصل ماضی میں وہ ایسی غلطی کا ارتکاب کر چکی تھی اور اب ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

امریکن بڑی پلاننگ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

وہ لوگ ہماری طرح ہوا میں تیر نہیں چلاتے۔ کچھ فیصلے قومی سطح پر بڑی سوچ بچار کے بعد کئے جاتے ہیں اور ان پر پھر بڑی منصوبہ بندی سے عمل کیا اور کرایا جاتا ہے---شاید اس مثال سے آپ کو بات سمجھ آجائے۔

کیلیفورنیا میں ڈاکٹر گوریوال کے گھر مجھے ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کو نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

امریکن بچے کمپیوٹر پر نوعمری میں کمانڈ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بچہ ہمارے حساب سے پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور اس روز اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا مصروف تدریس تھا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ان کمپیوٹرز کے لئے تمام پروگرام تیار شدہ مل جاتے ہیں مثلاً اس بچے کے پاس امریکن انسائیکلو پیڈیا اس ضمن میں موجود تھا۔ جس کا عملی مظاہرہ اس نے یوں کیا کہ ایک ڈسک اٹھا کر مشین میں ڈالی اور مجھ سے کہا کہ آپ

نیا کے کس ملک کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔

خاکسار نے فوراً اپنے ملک کا نام لے دیا کیونکہ بطور پاکستانی ہمیں سب سے "م معلومات" اپنے ملک سے متعلق ہی حاصل ہوتی ہیں۔

ٹک ٹک ٹک ٹک ٹک

آوازیں نکلیں اور سکرین پر پاکستان کا نام آیا۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی کہ یکھوں اس ارض پاک سے متعلق امریکن کیا جانتے اور بتاتے ہیں----

سکرین پر باری باری معلومات آتی اور جاتی رہیں، کبھی پاکستان کا محل وقوع، کبھی آب وہوا، کبھی موسم، کبھی صوبوں، شہروں کا جغرافیہ وغیرہ وغیرہ۔

اب سکرین پر پاکستانی تجارت کی تفصیلات آنے لگیں اور اچانک ہی یوں لگا جیسے سی نے پورے زور سے میرے دل پر گھونسہ دے مارا ہو۔-

سکرین پر پاکستانی درآمدات اور برآمدات کی تفصیلات آرہی تھیں اور برآمدات یں باقی چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک فقرہ نمایاں حروف میں لکھا تھا۔

"غیر قانونی برآمد ڈرگز (ہیروئن)"

یہ معلومات امریکن بچوں کے نصاب کا حصہ ہیں جو انہیں سکول میں پڑھائی جاتی یں اور پاکستان سے متعلق یہی تصور لے کر یہ بچے جوان ہوتے ہیں۔

یہی "قیمتی معلومات" حاصل کرنے کے بعد یہ امریکن نوجوان حکومتی عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔

اور یہی نوجوان پھر ویزہ آفیسر، نائب قونصلیٹ، قونصل جنرل وغیرہ وغیرہ بن کر لاہور کراچی پشاور وغیرہ میں تعینات ہوتے ہیں۔

اب آپ کو سمجھ آجانی چاہئے کہ امریکن ویزہ آفیسروں کا رویہ پاکستانیوں کے ساتھ اتنا تضحیک آمیز اور بسا اوقات طیش دلا دینے والا کیوں ہوتا ہے؟

ان بے چاروں کا قصور کیا ہے؟ انہیں یہی پڑھایا، سمجھایا اور بتایا گیا ہے۔

○

میں جانتا ہوں سرکاری عمال کے کان پر میری اس بات کو سن کر جوں نہیں رینگے گی میں نے 89، میں جب میں اس "حادثے" سے گذرا اپنی پاکستانی غیرت اور حمیت کے ہاتھوں جذباتی ہو کر بڑے دکھی دل سے اپنے محکمہ تعلیم، وزارت خارجہ اور پرائم منسٹر ہاؤس کو اس حادثے کی تفصیلات کے ساتھ خطوط لکھے تھے۔

میں جانتا ہوں کہ جن سیکشن آفیسروں نے ان خطوط کو پڑھا ہوگا وہ مجھے بے وقوف سمجھ کر مسکرائے ہوں گے اس سے زیادہ رد عمل کی توقع مجھے تھی بھی نہیں۔

میں نے تو اپنا اخلاقی فرض نبھایا کیونکہ میں اپنی زمین کا کھا کر، اس کے خلاف ایسی سطحی نوعیت کی گالی برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ میری جڑیں اس زمین میں ہیں۔ اور میں "منی پلانٹ" نہیں ہوں۔

مجھے برساتی مینڈکوں، خودرو پودوں اور پلانٹس کا علم ہے۔ میں ان سے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں۔

مجھے علم ہے کہ ہمارے حکمران پاکستانی کم اور امریکہ کے گداگر زیادہ ہیں---ان کے اپنے مفادات ہیں۔

اپنا سوچنے کا الگ انداز ہے۔

لیکن---

میرا تعلق خواص سے نہیں عوام سے ہے۔

میں پہلے پاکستانی بعد میں کچھ اور ہوں۔

آپ مجھے وطن پرستی کا طعنہ دیں یا گمراہ ہونے کی گالی سے نوازیں۔

لیکن---!

مجھ سے پاکستانی ہونے کا حق نہیں چھین سکتے۔

بہر کیف یہ واقعہ لکھنے سے میرا مقصود تھا کہ آپ کو علم ہو جائے کہ پاکستان سے تعلق ایسے نظریات رکھنا امریکی نصاب تعلیم کا حصہ ہے اور یہی تعلیم پاکستانی والدین کے بچے بھی حاصل کرتے ہیں اگر ان کے پاکستانی نژاد والدین انہیں بتاتے بھی رہیں کہ ان کا "اصل" کیا ہے تو اس سے فرق کیا پڑے گا۔ جلد ہی وہ اپنے والدین کو بے وقوف سمجھنے لگتے ہیں۔

اول تو بہت کم والدین ایسے ہیں جو اپنی ضد پر قائم رہیں اکثر خود کو بادل نخواستہ یا شوق سے ہی امریکن بنا لیتے ہیں جو نہیں بناتے ان کے بچے ان کے لئے مستقل ذہنی اور روحانی عذاب بن جاتے ہیں۔

احمقوں کی جنت میں رہنے والے اگر کچھ لوگ اس بات پر بضد ہیں کہ اپنے گھر میں قرآن پاک، پنجسورہ، قرآنی قاعدہ کچھ پاکستانی رسالے کتابیں رکھ کر یا ڈرائنگ روم میں انار کلی کے کسی بازار میں ہنڈی کرافٹ کی دکان سے خرید کردہ کوئی پاکستانی سجاوٹ کی چیزیں رکھ کر خانہ کعبہ کی تصویر یا بسم اللہ الرحمن الرحیم اور کلمہ طیبہ کے کتبے کچن اور سٹنگ روم کی دیواروں پر سجا کر وہ اپنے بچوں کا رابطہ اپنی زمین سے جوڑ سکتے ہیں تو ان کی مرضی۔

حقائق کچھ اور ہیں----

خاصے تلخ اور جان لیوا---

تاثر جو بھی دیا جائے عمل اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ پاکستانی نژاد گھرانوں میں کچھ پاکستانیوں کو (جو بلاشبہ ہمارا فخر ہیں) چھوڑ کر زیادہ تعداد ان کی ہے جن کی عورتیں اپنے خاوند کے ڈانٹنے پر پولیس طلب کر لیتی ہیں۔

جن کی بچیاں بے راہروی کا شکار ہیں۔

جن کے بچے انہیں اپنے والدین ماننے سے ہی انکاری ہیں۔

پریشان کر دینے والی بات یہ ہے کہ جن عورتوں کا میں نے تذکرہ کیا وہ بہت تعلیم یافتہ نہیں پاکستان کی دس بارہ جماعتیں پڑھی ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق بھی بہت ماڈرن گھرانوں سے نہیں بلکہ بیشتر کا تعلق پاکستانی شہروں کے قدیم محلوں سے ہے یہ الگ بات کہ اندرون لاہور شہر کی جو خاتون امریکہ میں بیاہی جائے وہ کچھ عرصہ بعد خود کو گلبرگ یا کسی اور ''پوش علاقے'' سے متعلق بتانے لگتی ہے۔

○

''امریکی پاکستانی'' ہمارے ہاں بھی بہت پائے جاتے ہیں اور امریکہ میں تو ہیں ہی......!

پاکستان کا رزق کھا کر پلنے والے،

پاکستانی پاسپورٹوں پر امریکہ جانے والے۔

یہ وہ بدبخت پاکستانی ہیں جو گرین کارڈ ملنے پر پہلی گالی اپنی دھرتی ماں کو دیتے ہیں۔

بالٹی موڑ کا رہائشی، گجرات کے نزدیکی گاؤں ''کنجاہ'' کا پیدائشی جس نے محض اپنے ایک ہندو ہمسائے کو خوش کرنے کے لئے اپنی بیٹی کی سالگرہ کی تقریب میں میرے سامنے اپنی زمین کو گالی دی تھی۔

پاکستان میں مصائب و مشکلات کو ہزار چند بنا کر بیان کیا تھا---

جس نے جھوٹ کی انتہا کرتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ اس نے کراچی ایئرپورٹ سے پانی کا گلاس دس روپے میں خریدا تھا۔

''زمین کا کوڑھ'' ہے---!

لعنت ہے اس پر جس نے ''کنجاہ'' کے غیرت مندوں سے اپنا جھوٹا تعلق ظاہر کیا---شاید اس گدھے کو اس بات کا علم نہیں کہ جس زمین سے اس نے اپنا جھوٹا ناطہ

قائم کیا ہے اس نے پاکستان کی ہریالی میں کتنے شہیدوں کا لہو شامل کیا ہے---

میں جانتا ہوں جب وہ مرے گا تو اس کی لاش دفن ہونے کے لئے یہاں لائی ائے گی۔

لیکن---

وہ نہیں جانتا کہ اگر اس گاؤں کے لوگوں کو اس کی اصلیت کا علم ہو گیا تو وہ اپنے ؤں میں اس کی لاش بھی دفن نہیں ہونے دیں گے۔

یہ بدبخت ساری زندگی امریکہ میں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف ہذیان بکتے ہیں اور رنے کے بعد دفن ہونے کے لئے یہاں آ جاتے ہیں۔

مجھے زیادہ علم نہیں لیکن ایک مرتبہ لندن سے اسلام آباد آتے ہوئے ایک غیرت مد پاکستانی جو جرمنی سے آ رہے تھے نے مجھے بتایا کہ جرمن میں ترک مسلمان زیادہ ہیں ر ترکی کا یہ قانون ہے کہ جس ترکی نژاد مسلمان نے جرمنی کی شہریت اپنالی ہو وہ اس لاش کو ترکی میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دیتے----!

خدا کرے پاکستان میں بھی کوئی غیرت مند حکمران یہ قانون بنا جائے---!

اپنی زمین کے ان غداروں کو پھر عیسائیوں کے قبرستانوں میں دفن ہونا پڑے۔

افسوس ان پاکستانیوں نے اپنی جڑوں سے کٹ کر جینے کا بھونڈا اور غیر قدرتی راستہ یا۔

لیکن----!

یہ لوگ پاکستان کی پہچان نہیں----!

اگر وہ خود کو پاکستانی نہیں سمجھتے تو پاکستان کو بھی ان کی ضرورت نہیں۔

ہماری پہچان نیویارک اور لاس اینجلس کے وہ ہزاروں پاکستانی نوجوان طلباء، بات، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان ہیں جو دن رات پاکستان کا دم بھرتے ہیں۔

جو ایک لمحہ کے لئے بھی خود کو اپنی زمین سے الگ نہیں کر پاتے۔

جو اسی حوالے کے ساتھ جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

امریکہ میں سید جعفر حسین، میاں محمود قریشی اور عبدالرزاق ملک جیسے پاکستانی بھی آباد ہیں۔ یہی لوگ پاکستان کی آبرو ہیں۔

پاکستان کا فخر ہیں----!

پاکستان کو ان پر مان ہے!

طارق اسمٰعیل ساگر

لاہور

زندگانی رہرو راہ فنا ہے اے اسد
ہر نفس ہستی سے تا ملک عدم اک جادہ ہے

(اسد اللہ غالب)

امریکہ دنیا کا سب سے بڑا مقروض ہے اس کی فلک بوس اور بلند و بالا عمارات پر نہ جایئے رات کے دوسرے پہر سردی سے ٹھٹھرتے انسانوں کے اس انبوہ کثیر پر نظر ڈالئے جو ان بلڈنگوں کے کونوں کھدروں میں، پارکوں میں، ریلوے سٹیشنوں، سب وے اور ہوائی اڈوں کی عمارتوں میں رات بسر کرنے کے لئے چپکے نظر آتے ہیں۔

صرف نیویارک میں 5 لاکھ عورتیں جسم فروشی کے ذریعے اپنا نان نفقہ چلاتی ہیں روزانہ نیویارک میں ایک لاکھ سے زائد افراد کو پارکوں میں رات بسر کرنا پڑتی ہے۔ امریکہ میں ہر پندرہ منٹ کے بعد کوئی خاوند یا بوائے فرینڈ اپنی بیوی یا داشتہ کو جسمانی تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ یہاں کی 80 فیصد شادی شدہ عورتوں کے غیر مردوں سے اور 90 فیصد شادی شدہ مردوں کے غیر عورتوں سے تعلقات استوار ہیں امریکہ کی ہر چوتھی فیملی میں ون پیرنٹ چائلڈ موجود ہے امریکہ کا 7 سال کی عمر تک کا ہر چوتھا بچہ جنسی ہوس کا شکار ہو چکا ہے۔

جی ہاں! یہی ہے وہ امریکہ جس نے اپنی معیشت اور معاشرت کی مضبوط بنیادیں استوار کرنے کے لئے سب سے پہلے 2 ملین لوگوں کو ایشیا سے لا کر امریکہ میں آباد کیا تھا اور جہاں اب ایشیائی لوگوں کے داخلے بند کرنے کے لئے تمام قانونی شکنجے حرکت میں لائے جا رہے ہیں 80 فیصد یورپین نسل کی آبادی والے ملک امریکہ کو دیکھنے کا شوق مجھے بھی کشاں کشاں امریکہ لے گیا۔ پہلی مرتبہ میں نے 1988ء میں امریکہ کا

دورہ کیا۔ اپنی آمد پر جس پہلے عظیم الشان صدمے سے دوچار ہونا پڑا وہ پی آئی اے کی متعلقہ فلائٹ سے 14 پاکستانیوں کی واپسی تھی۔

یہ صاحبان جعلی پاسپورٹوں اور سفری دستاویزات کے ذریعہ امریکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اور اس قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے خواہش مند تھے جو اپنی آنکھ کے شہتیر کے علاوہ سب کچھ دیکھ لینے پر قادر ہے۔

ظاہر ہے میری آمد یہاں کسی خوشگوار ماحول میں نہیں ہوئی تھی اور مجھے بھی ان کڑے مراحل سے دوچار ہونے کے بعد امریکہ میں داخلے کی اجازت ملی جس سے ہر پاکستانی کو دوچار ہونا پڑتا ہے میری صحافیانہ حیثیت کے پیش نظر امیگریشن آفیسر خاتون نے مجھے یہ اطلاع دینا ضروری جانا کہ جس پرواز سے میں یہاں پہنچا ہوں اس سے 14 پاکستانیوں کو "امریکہ بدر" بھی کیا جا رہا ہے اطلاع دینے کا انداز طنزیہ تھا یا دھمکی آمیز اس کا اندازہ تب مجھے یوں نہ ہو سکا کہ میری تمام تر توجہ باہر موجود میزبانوں پر مرکوز تھی ایک تو فلائٹ ہی خیر سے 4 گھنٹے تاخیر سے روانہ ہوئی اس پر مستزاد یہ کہ امیگریشن سے میرا چھٹکارا ایک گھنٹے بعد ہوا کیونکہ 14 کا ٹولہ مجھ سے پہلے ہی قطار میں کھڑا ہو چکا تھا۔

○

کسٹم پر میں نے رضاکارانہ طور پر سامان کھول کر چیک کروانا زیادہ مناسب جانا بصورت دیگر بھی یہی کچھ ہوتا کیونکہ یہاں پاکستانی فلائٹس سے آنے والوں کے لئے کوئی "گرین چینل" موجود نہیں۔

بہر کیف میرے اس رضاکارانہ جذبے نے نیگرو خاتون کسٹم آفیسر کو متاثر کیا اور اس نے ایک سرسری نظر ڈالنے پر ہی اکتفا کیا اور مسکراہٹ کے ساتھ مجھے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ باہر کوئی میرا منتظر نہیں تھا امریکہ میں کم از کم 5 گھنٹے کوئی کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا فون کر کے ایک سکھ دوست کو اپنی آمد سے مطلع کیا اور رات

محفوظ گزارنے کا سامان ہوا اس واقعہ کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ نیویارک میں پی آئی اے کی کارکردگی اگر اطمینان بخش بھی ہے تو کم از کم امریکہ میں موجود دیگر لائنوں کے معیار کی ہرگز نہیں۔

شاید ہی کبھی آپ کو یہاں سے علم ہو سکے کہ فلاں پی آئی اے کی فلائٹ جو پاکستان سے فلاں وقت روانہ ہوئی تھی کب اور کس وقت نیویارک پہنچے گی۔

جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں اس میں قصور شاید ان لوگوں کا بھی نہیں ہے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ گوروں کا روایتی تعصب جو ہمارے تئیں روا رکھتے ہیں اس کی وجہ ہے-----

حیرت کی بات ہے کہ پی آئی اے کے ساتھ امریکن بالکل سوتیلی ماں کا سلوک کرتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ پاکستان کے کسی ایئرپورٹ سے کوئی امریکن جہاز نہ پرواز کرتا ہے نہ لینڈ کرتا ہے۔ عموماً بہت دیر تک پرواز کرنے کے بعد ہی پی آئی کے جہاز کو نیویارک کے جے ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت ملتی ہے۔

کئی دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاز کو نیویارک کی بجائے واشنگٹن بھیج دیا جاتا ہے جہاں تین چار گھنٹے مسافروں کو جہاز میں قید رکھنے کے بعد (کیونکہ لاؤنج میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی) جہاز کو دوبارہ نیویارک کی طرف جانے کی اجازت ملتی ہے آپ حیران نہ ہوں میں نے حسن ظن سے کام لیا ہے یہ وقفہ کبھی کبھی چھ گھنٹے بھی ہو جاتا ہے۔

خدا جانے یہ بزعم خویش مہذب اقوام آخر ہمیں کس جرم کی سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے مسلم ممالک بھی کبھی کبھی نہ سمجھ میں آنے والی پالیسیاں اختیار کر لیتے ہیں مثلاً کراچی سے جو پی آئی اے کی پرواز تب براستہ قاہرہ پیرس نیویارک جاتی تھی جب یہ پرواز قاہرہ پر رکی تو وہاں بھی ہمیں ٹرانزٹ میں جانے

کی اجازت نہیں ملی۔

آخر پی آئی اے سے ایسا امتیازی سلوک کیوں؟

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں عموماً بڑے واقعات یا حادثات کا پیش خیمہ بنتی ہیں اور ان ہی اقدامات سے کسی بھی ملک کے شہریوں پر دوسرے ملک سے متعلق مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آج جب ہم ایک ایٹمی قوت بن چکے ہیں اور دن رات ہمارے حکمران اپنے ہی لئے رطب اللسان رہتے ہیں تو ان سے یہ درخواست کرنا کچھ عجیب نہیں لگتا کہ کم از کم مسلم ممالک سے ہی اپنی قومی ائر لائن کے احترام کا تقاضا کرتے رہا کریں۔

اس سے پہلے گو کہ میں نے متعدد مرتبہ یورپی ممالک کا دورہ کیا ہے---لیکن-- امریکہ میں یہ میری پہلی آمد تھی اور میں واقعی محسوس کر رہا تھا کہ ایک الگ جہان میں آگیا ہوں کسی دوست نے کہا تھا لندن تو امریکہ کا ایک گاؤں ہے اور تجربے نے یہ بات سچ ثابت کر دی واقعی سر بفلک عمارتوں، پلازوں اور بہت بڑے انفراسٹرکچر والا امریکہ الگ تھلگ ہی دکھائی دیتا ہے۔

○

نیویارک دنیا کا شاید سب سے منفرد حیثیت کا حامل شہر ہے جس کا رقبہ 319 اعشاریہ 8 مربع میل ہے اور آبادی 80 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے نیویارک کو بنیادی طور پر 5 بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کوئنز ان میں سب سے بڑا حصہ ہے اس کے بعد مشہور عالم بروک لین ہے پھر برونکس، سٹیٹن آئی لینڈ اور مین ہٹن۔

مین ہٹن پر ہی مشہور عالم ورلڈ فنانشل سنٹر موجود ہے جہاں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی 275 منزلہ عمارت اپنے دو عظیم الشان ٹاورز کے ساتھ ایستادہ ہے کبھی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو دنیا کی سب سے اونچی عمارت ہونے کا اعزاز حاصل تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔

مین ہٹن کے ایک سے دوسرے کونے تک گھوم جائیے دنیا بھر کی معیشت کے
اعصابی مراکز وال سٹریٹ سمیت یہیں موجود ہیں امریکن ایکسپریس کی بلڈنگ کے
ساتھ ہی پھر ڈاؤن ٹاؤن شروع ہو جاتا ہے۔

مین ہٹن آئی لینڈ کو 5 پل نیویارک سے ملاتے ہیں اور ایک پل سے روزانہ 2 لاکھ
گاڑیاں اوسطاً گزرتی ہیں اگر براڈوے پر آیئے تو آپ کو مشہور عالم شاپنگ سنٹر "میسی"
کے ساتھ ہی فلپائن کے صدر مارکوس کی وہ بلڈنگ بھی دکھائی دیتی ہے جو آج دونوں
حکومتوں کے درمیان وجہ تنازعہ بنی ہوئی ہے یہ بلڈنگ 34 ویں شاہراہ پر مارکوس کی
بے بسی کی تصویر بنی نظر آتی ہے۔

اگر آپ نیویارک میں موجود ہوٹلوں، موٹلوں۔ تھیٹروں، میوزک اور ڈانس
سنٹرز، میوزیم، شاپنگ سنٹر، باغات اور دیگر تفریح گاہوں کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیں تو
ماہرین کے اندازے کے مطابق آپ کو کم از کم ایک سال کا عرصہ درکار ہو گا۔

نیویارک کو امریکہ کا معاشی اور تجارتی مرکز ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے یہاں
امریکن تعمیر و ترقی کے تمام اعصابی مراکز موجود ہیں جہاں ایک ایک رگ دبانے سے
الگ الگ نتائج حاصل ہوتے ہیں اور یہاں بیٹھ کر ہی دراصل امریکی دنیا کی معیشت سے
کھیلتے ہیں کبھی کبھی یہ کھیل مہنگا بھی پڑتا ہے 88 کا "وال سٹریٹ کرائس" اس کی بہترین
مثال ہے۔

35 لاکھ افراد صرف نیویارک کے بنکوں، تعمیراتی پلانٹس اور فنانشل مراکز میں
مصروف کار رہتے ہیں اور دفتری اوقات کار میں یہاں واقعی تل دھرنے کی جگہ نہیں
ملتی نیویارک کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو دیکھ کر پاکستان کی ڈرائیونگ بے ساختہ یاد آتی ہے
لوگ بھی ڈرائیونگ کے اصولوں کو اتنا ہی خاطر میں لاتے ہیں جتنا پاکستان کے ٹیکسی
ویگن اور رکشہ ڈرائیور۔

انسانی پستی کا بدترین نظارہ یہاں کی رسوائے زمانہ 42 سٹریٹ پر موجود ہے جہاں
شین میں ایک کوارٹر کا سکہ ڈالنے سے آپ چند منٹ تک جنسی بہیمت اور بے حسی کا
ترین نظارہ کر سکتے ہیں۔

اگر مین ہٹن سے آپ محفوظ نکل آئیں تو خوش قسمت ہیں بصورت دیگر آپ کو
ی نہ کسی حادثے سے دوچار ہونا پڑتا ہے مقامی نیگرو آبادی کے بگڑے ہوئے نوجوان
ر نوعمر چند سکوں کے لئے آپ کو موت کے گھاٹ بھی اتار سکتے ہیں۔ یہاں دن کے
قات میں کاروں کے دروازے اندر سے بند رکھے جاتے ہیں رات کو تو یہاں سے
زرنے کا تصور ہی محال ہے اگر آپ کسی حادثے سے دوچار ہوئے تو کسی اور کے کسی
ادثے سے دوچار ہونے کی خبر آپ کو ضرور مل جائے گی۔

نیویارک اپنے اندر ایک جہان بسائے ہوئے ہے----

ہمارے ملک سے خصوصاً وہ ایڈونچر پسند نوجوان جو یہاں ایجنٹوں کو لاکھوں روپے
ے کر جعلی کاغذات پر امریکہ جاتے ہیں وہ عموماً نیویارک ہی کو اپنا مسکن بناتے ہیں۔
خصوصاً مین ہٹن اور کوئینز میں آپ کو پاکستان اور بھارت کے باشندے زیادہ تعداد میں
نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے مستقبل قریب میں کبھی ان دونوں کو لندن کے ساؤتھ ہال
ور آل گیٹ والی حیثیت حاصل ہو جائے----

نیویارک میں آپ کو اکثر وہ بدقسمت پاکستانی بھی مل جاتے ہیں جو امریکہ ڈالر
مانے کی دھن میں اپنا اثاثہ فروخت کر کے جیسے تیسے یہاں پہنچتے ہیں اور پھر حسرت
یاس کی تصویر بنے کسی گیس سٹیشن، فاسٹ فوڈ یا براڈوے کے کسی موڑ پر نظر آ جاتے
ہیں۔ یہ وہ پاکستانی ہیں جو آنکھوں میں ہزاروں خواب سجا کر یہاں آئے تھے۔

لیکن-----

ایک ایک کر کے ان کے خواب پھر ٹوٹتے چلے گئے اور اب ان بے چاروں کی

حالت دھوبی کے اس کتے والی ہو کر رہ گئی ہے جو نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا میں آپ کو ایسے کئی نوجوانوں کی کہانیاں سناؤں گا لیکن پہلے ایک اور ملاقات کا تذکرہ ہو جائے۔

جن دنوں میں نے امریکہ کا پہلا سفر کیا تھا۔ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی وفات کے بعد الیکشن ہوئے تھے اور پیپلز پارٹی نے زمام اقتدار سنبھالا تھا۔ پیپلز پارٹی کو چونکہ ۷۷ء کے گیارہ سال بعد بر سر اقتدار آنے کا موقعہ ملا تھا اور تب عام تاثر یہی تھا کہ پیپلز پارٹی امریکہ سے متعلق نرم گوشہ نہیں رکھتی اور ان حالات میں جب کہ جنرل ضیاء الحق ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔

گیارہ سال بعد پاکستان مین جمہوریت کو دوبارہ زندگی ملی تھی کیونکہ اس سے پہلے جونیجو حکومت کو دنیا نے ابھی تک مکمل جمہوری حکومت تسلیم نہیں کیا تھا۔

امریکہ کو ہماری سیاست میں کلیدی مقام حاصل رہا ہے اس لئے میری خواہش تھی کہ پاکستان میں آنے والی اس اہم تبدیلی کے حوالے سے امریکیوں کے تاثرات جان سکوں۔ یہی کچھ سوچتا میں اب جے ایف کے ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں رزاق کا منتظر تھا۔ رزاق امریکہ میں ٹیکسی ڈرائیور ہے---

پاکستان میں اس نے ایم۔اے پھر ایل ایل بی اور آخر میں بی کام بھی کر لیا تھا لیکن ایک متوسط گھرانے کا نوجوان ہونے کی وجہ سے وہ کوئی باعزت نوکری حاصل نہیں کر سکا۔ کبھی کسی آفس میں کلرک کی جاب مل گئی اور کبھی کسی بڑے وکیل صاحب کے ساتھ منشی گیری شروع کر دی وہ نا مطمئن تھا---

پاکستان کے ان لاکھوں نوجوانوں کی طرح جنہیں کالج کی زندگی بڑے بڑے خواب دکھا کر زندگی کے جہنم میں دھکیل دیا کرتی ہے اور جب وہ عملی زندگی کے باکسنگ رنگ میں قدم رکھتے ہیں تو زندگی کا پہلا ہی گھونسہ کھا کر چاروں شانے چت ہو جاتے ہیں۔

خدا جانے ہمارے ارباب دانش یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام

سے سوائے کلرکوں کی فوج ظفر موج یا پھر فریسٹریشن کے مریضوں کا انبوہ کثیر ہی جنم لے سکتا ہے۔

رزاق باہمت نوجوان تھا۔ جیسے تیسے وہ بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح دنیا بھر کے سمندروں میں گھومتا پھرتا کسی نہ کسی طرح امریکہ داخل ہو گیا جہاں اس نے اپنی تعلیمی ڈگریوں کو ایک بریف کیس میں بند کر کے مقامی پاکستانی ڈرائیوروں سے یاد اللہ کی اور چھ سات ماہ کی جان توڑ مشقت کے بعد ورک پرمٹ کے ساتھ ساتھ ڈرائیونگ لائسنس بھی حاصل کر لیا اور اب ڈرائیونگ کے مزے لوٹ رہا تھا۔ رزاق ابھی تک پاکستانی عادتیں نہیں بھولا تھا۔ اس لئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجھے لینے آ گیا۔ ہم دونوں اس کی ٹیکسی میں ہی اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچے جہاں مجھے رات بسر کرنی تھی۔ میں چاہتا تو آسانی سے فلاڈلفیا طاہرہ کے ہاں جا سکتا تھا لیکن رزاق بضد رہا کہ رات میں اس کے ہاں ہی گذاروں۔

○

مجھے اگلے روز فلاڈلفیا جانا تھا فلاڈلفیا کا فاصلہ یوں تو نیویارک سے بمشکل سو میل رہا ہو گا درمیان میں نیوجرسی اور اٹلانٹک سٹی ہی آتے ہیں۔ رات کا وقت تھا ایک پاکستانی بھائی سے مشاورت کی کہ کون سا ذریعہ سفر اختیار کیا جائے اس نے فوراً ہی فیصلہ دے دیا کہ پرائیویٹ کار لے لو زیادہ سے زیادہ سو یا ڈیڑھ سو ڈالر تک خرچ آئے گا سفر بھی محفوظ رہے گا ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے سے بھی بچ جاؤ گے انجوائے کرتے جانا سفر کا بھی مزہ آ جائے گا۔

میں نے اس جہاندیدہ شخص کی رائے کو صائب جانا اور زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرتے ہوئے رزاق کو بتائے بغیر ایک پرائیویٹ کار میں سوار ہو گیا کار ڈرائیور ویسٹ انڈیز کا رہنے والا اور کرکٹ کا عاشق تھا کمبخت تمام راستے عمران خان، ظہیر

عباس، میاں داد کے گن گاتا آیا راستے میں جگہ جگہ کار روک کر سڑک کے کنارے قابل دید مقامات کی نشاندہی بھی کی اسلام پر خاصی عالمانہ گفتگو بھی کرتا آیا میں اس کی معلومات اور اسلام دوستی کا فلاڈلفیا پہنچتے تک خاصا مداح بن چکا تھا امریکہ میں پہنچ کر اچھا بھلا آدمی امریکیوں جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے میں بھی اپنے ان پیاروں کو جن کے ہاں جارہا تھا امریکی سٹائل میں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ جو مجھے خاصا مہنگا پڑا۔

میری مداحی کا سارا بھرم ٹوٹ گیا جب اس ظالم نے مجھے مطلوبہ گھر کے سامنے پہنچ کر بل سے آگاہ کیا یہ اتنا ہی تھا جتنا ان دنوں پاکستان سے لندن تک جہاز کا کرایہ بنتا تھا۔

مجھ تہی دست کے پاس تھا ہی کیا جو اس گرگ جہاندیدہ کی نذر کرتا۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے میری مالی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھے یہ دھمکی بھی دے دی کہ اسے چونکہ یہاں پارکنگ میسر نہیں آرہی اس لئے کرایہ بھی کار کے اندر ہی ادا کرنا ہوگا اور وہ ایک لمحہ کے لئے بریک لگائے گا جب مجھے اپنے بیگ سمیت اتر جانا چاہئے خیریت گزری کے میزبان باہر موجود تھے۔ جنہوں نے میری مالی معاونت کی اور میں اپنے ٹھکانے تک پہنچا۔

○

مہربان ڈرائیور نے میری مالی اور نفسیاتی حالت ایسی بگاڑ دی تھی کہ اپنے میزبان محمود قریشی صاحب کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دیر تک اس حادثہ جانکاہ سے سنبھل نہ پایا میں بڑی مہذب ڈاکہ زنی کا شکار ہوا تھا۔ یہاں کے قوانین کے مطابق جن کا علم مجھے نہیں تھا کہ کسی اجنبی کو کرائے سے آگاہ کرنا احسن خیال کیا جاتا ہے۔ اس ظالم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

میرے میزبان فرشتہ صفت لوگ تھے۔ انہوں نے امریکہ جیسے بے مہر ملک میر رہنے کے باوجود اپنی اصلیت کو ابھی تک نہیں بھلایا تھا ان کے ہاں وہی لاہور والی

گرمجوشی، محبت اور مہمان نوازی موجود تھی۔ محمود قریشی اور مسز قریشی فلاڈلفیا میں بسنے والے مسلمانوں کے نزدیک دو قابل احترام شخصیتیں ہیں۔ مسلمانوں نے یہاں جو مسجد آباد کی ہے اس میں محمود قریشی کا خاصا ہاتھ رہا ہے۔ یہ مسجد مسلمانوں نے ایک پرانی ہال نما عمارت خرید کر آباد کی ہے جو یہاں کے مسلمانوں کا واقعی اس لامذہب معاشرے میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ مسجد کی اندرونی مرمت اور مطلوبہ اشیاء کی فراہمی میں محمود قریشی کا حصہ نمایاں ہے۔

دونوں میاں بیوی کی تحریک پر مقامی مسلمان آبادی کے لوگ نماز جمعہ یہاں پڑھتے ہیں۔ رمضان میں بھی کچھ رونق رہتی ہے اور وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی تقریب کے حوالے سے یہاں کوئی نہ کوئی اجتماع بھی ہوتا رہتا ہے۔

غیر ممالک میں بس جانے والے کچھ بزعم خویش مہذب پاکستانیوں میں ایک قباحت اکثر دیکھنے کو ملتی ہے کہ متعلقہ ملک کی شہریت حاصل کرتے ہی یہ لوگ سب سے پہلے مادر وطن کے خلاف ہذیان بکنے لگتے ہیں جو ان کے "مہذب" ہونے کی بظاہر نشانی ہوتی ہے۔

میرے مشاہدے میں ایسی بہت دل دکھانے والی باتیں غیر ممالک میں آتی رہتی ہیں یہاں بھی ایک ایسے ہی صاحب سے پالا پڑا جنہیں پاکستان کے نظام ٹریفک، فضائی آلودگی اور بہت سی دیگر شکایتیں تھیں۔ ایسے لوگ اپنی معلومات کا رعب گانٹھنے کے لئے اپنی طرف سے بہت سی من گھڑت باتیں بھی پاکستان سے منسوب کر دیتے ہیں۔ جو صاحب یہاں بڑھ چڑھ کر پاکستانی عوام کی غیر اسلامی حرکات کا رونا رو رہے تھے ان کے متعلق یہ بات میرے علم میں آئی کہ اگلے ہی روز انہوں نے اپنی صاحبزادی کی سالگرہ ایک مقامی ہوٹل میں کی جہاں موجود بیشتر ڈشوں میں مکروہ گوشت استعمال ہوا تھا یعنی "جھٹکے" والا گوشت۔

اس ملک میں ایسے ماڈرن مسلمان بدقسمتی سے حلال حرام کی تمیز کئے بغیر کھاتے پیتے ہیں اور اب تو یہ ایک فیشن سا بن گیا ہے۔ مسٹر محمود اور مسز قریشی نے اس قباحت کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی ہے اور مقامی مسلمانوں کو اسلامی آداب سے روشناس کروانے کے لئے انگریزی زبان میں بہت سا لٹریچر پاکستان، لندن اور عرب ممالک سے منگوا کر تقسیم کر رہے ہیں۔ ایک اور قابل ذکر خدمت ان دونوں کی یہ ہے کہ مسلمان بچوں کے والدین کو بچوں کو ناظرہ قرآن پاک پڑھانے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں حال ہی میں انہوں نے قرآن سیکھنے کے ابتدائی قاعدے اور سیپارے منگوا کر تقسیم بھی کئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہاں بیشتر مسلمانوں کے گھروں میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے یسرن القرآن بھی موجود نہیں تھے اب یہ کارنامہ دونوں میاں بیوی کے ذریعے انجام پا رہا ہے اور اسلامی اخلاق اور عبادات پر بھی وہ بہت سا لٹریچر منگوا کر یہاں تقسیم کر رہے ہیں۔

دونوں اپنے طور پر ہر وقت اس امر کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو جس طرح بھی ممکن ہو ایک جگہ اکٹھے ہو کر اپنے مسائل سمجھنے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کا موقعہ ملے۔ مقامی مسجد میں اکثر تقاریب کا محرک ان ہی کی ذات ہوتی ہے مسز انجم قریشی نے مقامی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ بدقسمتی سے بہت سے مسلمان اسلام کی ابتدائی تعلیمات سے بھی نابلد ہیں اور وہ مغربی سوسائٹی کے اتنے دلدادہ ہو گئے ہیں کہ ان لوگوں کی طرح رہنا سہنا اور کھانا پینا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنی ابتدائی شناخت یعنی مسلمان ہونے کو بھی کبھی درخور اعتنا نہیں جانا ہماری اولین کوشش تو یہی ہے کہ والدین کو اس بات کا قائل کریں کہ وہ خود اسلامی روایات واقدار کی پابندی کریں اور کوشش کریں کہ ان کے بچے بھی مسلمانوں کے

نظر آئیں۔

ہم قرآن سوسائٹی کے ذریعے بچوں اور والدین کو قرآن پاک پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور ان کے لئے انہیں تمام ممکنہ سہولیات بھی مہیا کرتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر مسلمان بچیوں کی طرف سے پریشان ہوں۔

مقامی قباحتوں کا رنگ ہمارے بچوں پر بہت چڑھ رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان کے والدین نے اسلامی تعلیمات پر کبھی زور نہیں دیا نہ اس کا کوئی عملی نمونہ پیش کیا۔

مسز قریشی نے صحیح بات کی تھی جس کا عملی تجربہ مجھے اگلے ہی روز ہو گیا۔

○

نومبر کی آخری جمعرات کو یہ لوگ "تھینکس گیوونگ" مناتے ہیں۔ جس سے کرسمس کی تقریبات کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے۔ اس تقریب کو جس روز یہ دن منایا جا رہا تھا میں ایک مسلم گھرانے میں مدعو تھا۔ جن کے انگریز ہمسایہ دوستوں نے ایک "ٹرکی" ان کے ہاں بھیجی جسے وہ لوگ مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

جب میں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ یہ "ٹرکی" ذبح ہوئے بغیر پکی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔

مغربی معاشرے نے دولت یا علم کے حصول کے لئے تارک وطن ہونے والوں کو جہاں بہت کچھ دیا ہے وہاں بہت سی قباحتوں سے بھی نوازا ہے ان لوگوں نے دنیا تو خوب کمائی ہے لیکن بے شمار روحانی مسائل بھی ان کا مقدر بن چکے ہیں۔

ایک ایسے گھرانے کی مثال حاضر ہے جہاں بیگم صاحبہ نے محض اس بات پر پولیس کو طلب کر لیا تھا کہ ان کے مجازی خدا نے انہیں گھر سے باہر رہنے پر ڈانٹ دیا تھا۔ ایک اور جگہ ایک صاحب زادی نے اپنے والد صاحب پر پولیس طلب کر لی تھی کہ وہ ان

کے کمرے میں بغیر اجازت گھسے اور مخرب اخلاق فلم دیکھنے پر غصے میں آکر نہ صرف
اس کا وی سی آر توڑ دیا بلکہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔

دونوں گھرانے پاکستان میں شادی شدہ تھے اور دس پندرہ سال پہلے ہی امریکہ میں
آباد ہوئے تھے۔ وہ اتنے معزز لوگ ہیں کہ پاکستان میں کوئی ان کی طرف سے ایسی
حرکت کی توقع ہی نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں بڑے مذہبی لوگ سمجھے جاتے ہیں۔

یہ ہے اس معاشرے کی بھیانک تصویر کا معمولی سا عکس جہاں جانے کی دھن
ہمارے نوجوانوں میں جنون کی طرح پھیل رہی ہے۔ جس ملک کی صاف شفاف
سڑکوں۔ اعلیٰ انسانی اقدار، صفائی کے بہترین نظام کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے
نہیں تھکتے۔ اس ملک نے انہیں ذہنی مریض بنا کر رکھ دیا ہے بغیر اجازت وہ اپنے بچوں
کے کمروں میں نہیں جھانک سکتے۔ انہیں کسی بری حرکت سے ڈانٹ ڈپٹ نہیں کر سکتے۔

ان لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ یہ پاکستان میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور دنیا کمانے
امریکہ آئے انہوں نے اپنی دانست میں امریکہ کا انتخاب صرف اپنے معاشی کے حل
کے لئے کیا تھا۔

لیکن---!

وہ نہ جان سکے کہ یہاں فکر معاش سے یونہی نجات نہیں مل جاتی۔

روحانی کرب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

کاش میں آپ کو بتا سکتا کہ جب بیٹیاں جوان ہو جائیں تو ان کے عیوب کو ماں باپ کس
طرح آنکھیں بند کر کے جھیل جاتے ہیں۔

اپنے بچوں کے ایسے ایسے نخرے بادل نخواستہ برداشت کرنے پڑتے ہیں جن
تصور ہی عام حالت میں محال ہے۔

ممکن ہے آپ نے بھی کسی ایسے پاکستانی کو دیکھا ہو جو اپنی بیٹی کو جوان ہونے سے
پہلے بیاہنے کے لئے پاکستان لے آیا ہو---!

بس یہی ایک کمزوری ہے جو ان لوگوں کو بالآخر اپنی زمین سے ٹوٹا رشتہ جوڑنے پر
مجبور کر دیتی ہے۔ بصورت دیگر امریکہ میں بسنے والے ہر پاکستانی کی پہلی اور آخری
خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساری نسل کو جیسے تیسے امریکہ ہی میں بسا لے۔

امریکہ میں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس نے سائنسی بنیادوں پر ترقی نہ کی ہو۔ سائنسی ترقی اور مادی دولت کے بل بوتے پر اس کی معاشرتی زندگی بظاہر بڑی روشن اور دلفریب نظر آتی ہے تاہم اس میں وہ تاریک گوشے بھی موجود ہیں جن پر روشنی ڈالی جائے تو وہ اپنی تمام تر کراہت انگیز شکل کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتے ہیں سائنسی اور مادی ترقی کے سب سے بڑے دعوے دار امریکی معاشرے کا ایک مکروہ پہلو وہاں بچوں یا نابالغوں میں عصمت فروشی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔

امریکہ میں جن بچوں کو قحبہ خانوں کی زینت بنایا جاتا ہے انہیں مڈویسٹرن شہروں سے لایا جاتا ہے۔ ہر سال ایسے بچوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ جنہیں اپنی بقاء کی خاطر اس قبیح فعل کو اپنانا پڑتا ہے۔ گلیاں، قحبہ خانے، بس شاپ ان بچوں کا مقدر بن چکے ہیں۔ امریکہ میں اس طرح کے بچوں کو منشیات، لالچ اور مار پیٹ کے ذریعے گھناؤنے کاروبار میں گھسیٹا جاتا ہے۔ یہ بچے عملی طور پر غلاموں کی زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ وہ جس گروہ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے کرتا دھرتا انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔

دنیا کے ابتدائی ترقی یافتہ ملک امریکہ کا شہر "نیویارک" ان مجبور بچوں کا سب سے بڑا مسکن ہے۔ معروف "ٹائمز سکوائر" میں پندرہ بلاکوں پر مشتمل "فیسیوٹا سٹرپ" جگہ ہے جہاں بچے دنیا کے اس قدیم دھندے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ گھر

بھاگے یا بھگائے گئے بچوں کا یہی مسکن ہے۔ جہاں سے وہ لوگ انہیں قحبہ خانوں یا پھر فحش تصاویر کے کاروبار کے لئے بھرتی کرتے ہیں۔ جن کا اول و آخر کام یہی ہے کہ یہ مذموم کاروبار چلایا جائے۔ یہاں کسی بھی وقت ۱۶ برس سے کم عمر کے بچوں کی تعداد 30 ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو ہر قسم کے گندے دھندے میں ملوث ہیں۔

امریکہ میں فحش تصاویر اور فلموں کا جو مذموم کاروبار ہو رہا ہے۔ اس کاروبار میں 20 فیصد کے قریب بچے کام کرتے ہیں یا اس میں ان بچوں کا عمل دخل ہے۔ اس طرح امریکہ میں لاکھوں نابالغ بچوں اور بچیوں کو گھناؤنے افعال میں شرکت پر مجبور کیا جارہا ہے۔ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے معاشرے کا اپنا ایک اقتصادی اور سماجی رنگ ہے۔ تاہم تیسری دنیا کے بعض ممالک بھی اس لعنت کا بری طرح شکار ہو رہے ہیں۔ جہاں اخلاقی و سماجی اقدار کسی حد تک معاشرے میں اپنا مقام رکھتی ہیں مگر ان بچوں اور بچیوں کی اکثریت غربت کے ہاتھوں اس پیشہ میں آئی۔ حکومت کا سماجی پروگرام ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا اور عالمی اداروں کے خصوصی فنڈز اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ انسانی حقوق کے تحفظ کا پرچار کرنے والے معاشرتی زندگی کے اس کراہت انگیز فعل پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ عالمی تنظیمیں اس مکروہ دھندے پر لب کشائی کرنے پر قول و فعل کے تضاد کا واضح ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

○

امریکی ریاست نیویارک میں اسقاط حمل کے سب سے زیادہ واقعات ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار حاملہ عورتوں میں سے 666 عورتیں اپنے حمل ساقط کرادیتی ہیں۔ وہ مرد اور عورتیں جنہوں نے شادی کرنے کا تکلف ہی نہیں کیا کل آبادی کا 12.20 فیصد ہیں۔

1970ء میں امریکہ میں کل 6 لاکھ 56 ہزار 4 سو 60 بچے پیدا ہوئے۔ جن میں ناجائز

بچوں کی تعداد ایک لاکھ 99 ہزار 9 سو تھی۔
1990ء میں 5 لاکھ 62 ہزار 330 بچے پیدا ہوئے۔ جن میں ناجائز بچوں کی تعداد 2 لاکھ 8 سو ایک تھی۔ اس طرح امریکہ میں ناجائز بچوں کی شرح پیدائش میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ان بچوں کی مائیں زیادہ تر نوعمر لڑکیاں ہیں۔

1990ء میں ایک لاکھ امریکیوں میں سے 395.90 فیصد افراد سنگین جرائم مثلاً زنا بالجبر کا شکار ہوئے۔

صورتحال یہ ہے کہ اب امریکہ میں بھی بوڑھی نسل کو اس مکروہ عمل سے کراہت ہونے لگی ہے اور وہاں اسقاط حمل کو ناجائز قرار دینے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

امریکہ کی معاشرتی زندگی کے بعض پہلوؤں سے پردہ اٹھائیں تو نہایت خوفناک مناظر سامنے آتے ہیں۔ اس کی تہذیب کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ اس کا فلسفہ زندگی شتر بے مہار کی طرح ہے۔ جدھر منہ اٹھ گیا اسی رخ پر چلتا گیا۔

امریکی زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک فرد کوئی جرم کرے تو وہ مستحق عقوبت ہے قوم کوئی جرم کرے تو لائق تحسین اور اس کا جرم تہذیب اور قابل فخر طریق زندگی قرار پاتا ہے۔ امریکہ میں جرائم کی رفتار تشویشناک ہے۔

ملک میں قانون کے پرجوش نفاذ اور مجرموں کے ساتھ پولیس کے سخت رویہ کے باعث گزشتہ پانچ سال میں جرائم کی شرح میں خاصی کمی ہو گئی تھی 1990ء اختتام تک ایک اعشاریہ آٹھ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ مغربی امریکہ میں رہنے والے زیادہ تر مجرموں کی سرگرمیوں کا شکار ہیں لیکن شمال مغربی امریکہ میں رہنے والے جرائم کی اس لہر سے قدرے کم متاثر ہوئے ہیں۔

بیورو آف جسٹس کے اعداد و شمار کے ایک جائزے میں اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے کہ امریکہ میں جرائم کی رفتار خوفناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ قومی اعتبار سے گھریلو قسم کے جرائم کی تعداد 6 لاکھ 13 ہزار سے بڑھ کر 3 کروڑ 47 لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ نیشنل کرائم سروے کے مطابق 1990ء میں ۳ کروڑ 47 لاکھ مقدمات درج ہوئے تھے۔

جرائم میں اضافہ ہونے کے سبب مقدمات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایڈمنسٹریشن حکام کا کہنا ہے کہ ماضی میں جرائم میں کمی کا سبب عوام کا تعاون سے زیادہ قانون پر سختی سے عمل درآمد کرنا تھا۔ اکیڈمی کے بعض ماہرین نے ان اعداد و شمار کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جرائم کی رفتار غیر متوقع طور پر بڑھ چکی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے گروپوں کا آپس میں اتحاد ہو گیا ہے جہاں جرائم ہوتے رہتے ہیں اس لئے چاروں قسم کے جرائم مثلاً زنا بالجبر، ڈکیتی، چوری میں اضافہ ہوا ہے اس میں قتل بھی شامل ہے۔ ایف بی آئی کی ایک رپورٹ کے مطابق نیویارک امریکہ میں ڈکیتی کی وارداتوں کا سب سے بڑا مرکز بن چکا ہے۔ گزشتہ سال نیویارک میں مجموعی 93377 ڈکیتیاں ہوئیں۔ جن کا مطلب ہر چھ منٹ بعد ایک ڈاکہ ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ امریکی عوام میں اسلحہ اور باڈی گارڈ رکھنے کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طرح سنگین جرائم کے سلسلہ میں قتل کی وارداتوں میں واشنگٹن پہلے نمبر پر ہے جہاں عوام پر ہمہ وقت قتل ہونے کا خوف طاری رہتا ہے۔

امریکہ اور سوئٹزرلینڈ سمیت یورپ کے دیگر اہم ممالک میں مردوں کی مالش کے لئے مخصوص دکانوں پر نابالغ بچے یہ کام انجام دیتے ہیں۔ ان ترقی یافتہ ممالک میں لائسنس یافتہ "مالش خانوں" کی تعداد سینکڑوں بتائی جاتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں ۵۰ کے

قریب مالش خانے قائم ہیں لیکن غیر سرکاری طور پر بہت سے گھروں اور حجاموں کی دکانوں پر سینکڑوں مالش خانے قائم ہیں جن میں نابالغ بچے اور بچیوں سے مذکورہ بالا کام لیا جاتا ہے۔

اگرچہ غلامی کے روایتی طور طریقے معدوم ہو چکے ہیں۔ تاہم نئی قسم کی غلامی فروغ پا رہی ہے۔ جس میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں مزدوروں کی منتقلی، بچوں سے زبردستی مشقت و محنت کے کام کروانا، فرد اور خواتین کا استحصال اور خاص طور پر جنسی مقاصد کے حصول کے لئے ان بچوں پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے یہاں بھی والدین اپنے بچوں کو دولت کے لالچ میں فروخت کرنے لگے ہیں۔ جس کا کچھ سال قبل تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

غلامی کی اس قسم کا قلع قمع کرنے کی خاطر مختلف بین الاقوامی اداروں کو مربوط اقدامات کرنے چاہیں کہ والدین اپنے معصوم بچوں کو فروخت نہ کر سکیں

امریکہ کے مشہور شہر نیویارک میں گزشتہ کئی برسوں سے نابالغ بچوں کے اغوا کرنے کی وارداتوں میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوتا جا رہا ہے اغوا کے پس منظر میں یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان نابالغ بچوں کو عالی شان ہوٹلوں میں شرمناک افعال کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امریکی حکومت نابالغ بچوں کے ان گھناؤنے واقعات پر کوئی حتمی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو چکی ہے کہ آخر یہ سلسلہ کس طرح ختم ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں امریکی محکمہ صحت نے ایک نیا قانون تیار کیا ہے جس کے تحت اگر 18 سال سے کم عمر کسی لڑکی نے وفاقی حکومت کے زیر اہتمام چلنے والے کسی کلینک سے مانع حمل ادویات طلب کیں یا نسخہ لکھوایا تو متعلقہ کلینک اس بات کی اطلاع مذکورہ نابالغ لڑکی کے والدین کو دے گا۔

اس وقت امریکہ کی کل آبادی ساڑھے چوبیس کروڑ ہے۔ جس میں 65 برس یا اس سے زیادہ عمر والے بوڑھے افراد کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اب ہر 8 امریکیوں میں سے ایک 65 سال یا اس سے زیادہ عمر رکھتا ہے گزشتہ دس برس کے دوران 65 برس کی عمر کے افراد میں 21 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ اس سے کم عمر کے افراد کی تعداد صرف آٹھ فیصد بڑھی ہے۔

اس طرح 85 برس کی عمر کے افراد بھی تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ان کی تعداد 30 لاکھ ہو چکی ہے۔ سو برس کی عمر پانے والے افراد بھی ان گنت ہیں اس طرح سو برس کی عمر والے افراد کی تعداد 2030ء تک تین لاکھ ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ ظاہر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ میں نوجوان لڑکیوں نے بوڑھوں سے شادیوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ یہی حال یورپ کے مختلف ممالک میں بھی ان دنوں نوجوان لڑکیوں کی طرف سے بوڑھوں کے ساتھ شادی کرانے کا شوق مسلسل بڑھ رہا ہے اس شوق میں گرفتار لڑکیوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ایسا کر رہی ہیں

ان لڑکیوں میں سے بعض ایسی ہوتی ہیں جو بچپن میں شفقت پدری سے محروم رہتی ہیں اور یوں ایک بزرگ شوہر کا پیار حاصل کر کے بڑھاپے کی نگرانی کا شوق پورا کرتی ہیں۔ کچھ لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بوڑھوں کی دولت پر ہاتھ صاف کرتی ہیں۔

نوجوان لڑکیوں کا خیال ہے کہ ان سے شادی کرنے والے بوڑھے نوجوانوں سے زیادہ فراخدل ہوتے ہیں۔ بوڑھوں سے شادی کرنے والی بعض لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی عملی زندگی میں پوری آزادی حاصل کر لیتی ہیں۔ بوڑھا شوہر مجبوراً ان کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔

یورپی ممالک میں اخلاقی اقدار کا زوال اس حد تک آ پہنچا ہے کہ ہم جنسی کے خوفناک مرض میں مبتلا لوگوں نے متعدد قراردادیں منظور کیں ہیں 1992ء کو ہم جنسی کا سال منایا گیا۔ ایک اور قرارداد میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن سے مطالبہ کیا ہے کہ ہم جنسی کو صحت کی عالمی تنظیم کی بیماریوں کی فہرست سے خارج کیا جائے۔

اٹلی کی عصمت فروش عورتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اپنا الگ اخبار جاری کر دیا ہے۔ اخبار کا نام "لیوسی کلا" ہے اس اخبار کو اطالوی جسم فروش عورتوں کی نمائندہ تنظیم چلا رہی ہے اس تنظیم کو شکایت ہے کہ ملک میں جسم فروشی پر کوئی قانونی بندش نہیں لیکن اس کے باوجود جسم فروش عورتوں کو بلاوجہ تنگ کیا جا رہا ہے۔

برطانیہ میں بھی موجود قانون کو بدلنے کے لئے خواتین سخت کوشاں ہیں کہ جسمانی مضبوطی اور برداشت کی قوت سے مردوں اور عورتوں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا یہ سلسلہ ختم ہونا چاہئے۔ حیرانگی اس بات پر ہے کہ ان کی نظر میں یہ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں ہے۔ امریکہ میں بے حرمتی اور بدکرداری کے گھناؤنے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے عالمی انسانی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والی تنظیمیں ان مکروہ اور معاشرتی خودکشی کے جرائم پر لب کشائی کرنے پر قول و فعل کے تضاد واضح ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

O

اگلے روز میں اپنے مہمانوں کے ساتھ "لونگ وڈ گارڈن" دیکھنے جا رہا تھا۔ دنیا کے مشہور گارڈن دیکھنے لائق ہے۔ یہاں مصنوعی موسم کے ذریعے دنیا کے مختلف براعظموں میں پائے جانے والے پھل اور پھول نہ صرف اگائے جاتے ہیں بلکہ اس کا ماحول بھی ہو بہو پیدا کیا جاتا ہے۔

اس گارڈن کو دیکھنے کی خواہش اس کی شہرت سننے کے فوراً ہی بعد دل میں جاگ

جاتی ہے۔ بلاشبہ لونگ وڈ گارڈن اس صدی کا عجوبہ ہے۔ کہیں ٹمپریچر بڑھا کر، کہیں بنا کر شیشے کے بڑے بڑے ہالوں میں پھول اور پھل کاشت کرنا سائنس کی ترقی کا ال نہیں تو کیا ہے۔ یہ گارڈن ڈیلاویر سٹیٹ میں واقع ہے لونگ وڈ 1700ء میں پائرز ندان نے کوئیکر خاندان سے فارم بنانے کے لئے خریدا تھا۔ اس جنگل نما باغ کو پائرز لی نے بعد میں بنا سنوار کر پائرز پارک کا نام دیا۔

پائرز خاندان کا مسٹر ڈی پائنٹ جو جنرل موٹرز کمپنی کا مالک اور ڈیوپاؤنٹ کا چیئرمین الونگ وڈ کا پہلا ڈیزائنر بھی کہلاتا ہے اور آج کا گارڈن اس کے خوبصورت ذہن کی فلیق ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ دنیا کے اس عظیم ترین گارڈن کو کوئی حکومت نہیں بلکہ یک پرائیویٹ تنظیم "منافع کے بغیر "Not for Profit" کے اصول پر چلا رہی ہے ر امریکہ کی طرف سے اسے کوئی فنڈ نہ تو کبھی ملا ہے اور نہ ہی انہوں نے کبھی اس کی واہش کی ہے اور تمام فنڈز مسٹر ڈیوپاؤنٹ کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں اس قصد کے لئے ایک ریسٹورنٹ اور سٹور قائم کیا گیا ہے جس کی ساری آمدنی یہاں رف ہو جاتی ہے۔

لونگ وڈ، 1650 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں سے 350 ایکڑ عوام کے لئے خصوص ہے۔ باقی حصہ پرائیویٹ اور شارع عام نہیں۔

"لونگ وڈ" میں 65 باغات قائم ہیں۔ جن میں سے ہر باغ اپنی انفرادیت کے لئے نیا میں الگ اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے اور اس کا ثانی شاید دنیا میں اور کہیں موجود نہ ہو۔ 300 ورکرز ہمہ وقت اس کی دیکھ بھال کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اس گارڈن یں سارا سال تعلیمی اور تفریحی پروگرام جاری رہتے ہیں۔

O

فلاڈلفیا سے لونگ وڈ گارڈن جانے کے لئے قریباً پچاس میل کی ڈرائیونگ کرنا پڑتی ہے امریکہ کی سڑکوں پر ڈرائیونگ کرنا بہت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔

بہت آسان اس طرح کہ آپ قانون کا احترام کرنے والے ڈرائیور ہیں تو آپ کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ کیونکہ یہاں اکثریت قانون شکنی سے مبرا ہے اور آپ کا واسطہ زیادہ تر اپنے جیسے لوگوں ہی سے ہوگا بصورت دیگر آپ کے لئے بے شمار مشکلات موجود ہیں کیونکہ جیسے ہی آپ سڑک کو فارغ سمجھ کر اپنی سپیڈ متعلقہ قطار کے لئے مخصوص رفتار سے بڑھائیں گے اگلے ہی موڑ پر کوئی نہ کوئی پولیس کا چاق چوبند ملازم پولیس کار پر آپ کے استقبال کے لئے موجود ہوگا۔

وہ آپ کو صرف اطلاع دے گا کہ آپ نے اپنی رفتار حد رفتار سے زیادہ بڑھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو جرمانے کا ٹکٹ تھما دیا جائے گا۔ حالانکہ آپ کو دوران سفر شاید ہی کبھی پولیس کی پٹرول پارٹی کو دیکھنے کا اتفاق ہوگا لیکن ان لوگوں کا طر واردات ہم سے ذرا مختلف ہے ہمارے ہاں پولیس حکام خصوصاً ٹریفک پولیس کے اہل چوک کے ایک کونے میں مجمع لگا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور قانون کا احترام کروا کے جذبے سے قطعی عاری اور مبرا یہ لوگ صرف ان لوگوں کے متلاشی رہتے ہیں قانون شکنی کریں اور ان کی جیب گرم ہو یا پھر چالان کر دیا جائے ہمارے ہاں چالان لئے بھی مجمع درکار ہے جس سکوٹر والے کا پولیس سارجنٹ چالان کرتا ہے اس کے عوام الناس کی ایک منڈلی جمگھٹا لگائے رکھتی ہے لیکن اس کے برعکس قانون کا اح کرنے والے ممالک کی پولیس عوام پر رعب داب کے بجائے عوام کی حفاظت خدمت کو اپنا اصول بناتی ہے اور جدید آلات کی مدد سے کڑی نگرانی کا نظام ترتیب جاتا ہے۔

قانون شکنی خواہ معمولی ہو یا اس کی نوعیت سنگین ہو جرم کرنے والا کوئی بڑا آ

یا چھوٹا اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سزا سے بچ سکے۔

لونگ وڈ گارڈن میں داخلے سے پہلے آپ کو آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ آپ کوئی کھانے پینے کی شے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے اس میں حکمت یہ پوشیدہ ہے کہ صفائی کا نظام قطعاً متاثر نہ ہو۔ کئی ایکڑ رقبے میں پھیلے اس جنگل نما باغ میں کنٹین جابجا موجود ہیں جہاں آپ لذت دہن سے بخوبی آشنائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن باغ میں گھوم پھر کر کھانے پینے کی سخت ممانعت ہے۔

زندہ قومیں اپنی ثقافت کے آئینہ دار مقامات کا اسی طرح تحفظ کیا کرتی ہیں افسوس ہم جو اس معاملے میں برتری کے بہر صورت دعوے دار ہیں اپنے آباؤ اجداد کی یادگاروں کو سنبھالنے کے فن سے بھی آشنا نہیں ہیں اور حالت یہ ہے کہ قدیم عمارات سے ملحقہ جدید بستیاں آباد کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں کئی آثار قدیمہ تو ان غیر اخلاقی حد تک غیر قانونی بستیوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔

○

اس گارڈن کو بلاشبہ بیسویں صدی کا عجوبہ کہا جاتا ہے جہاں شیشے سے بنے مختلف ہال موجود ہیں اور ہر ہال میں آپ کو ایک الگ دنیا آباد دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً ایک ہال میں جائیے تو یہاں برصغیر پاک و ہند کے پھل، پھول اور درخت ملیں گے۔ یہاں پاکستان اور بھارت میں پیدا ہونے والے پھول اور پھلوں سے لدے پھندے پودے اور درخت نظر آئیں گے۔ ایک اور عجیب بات فرض کیا پاکستان کے پہاڑی علاقے کا کوئی پھول دار درخت موجود ہے وہاں ہو بہو مصنوعی پہاڑی ماحول بھی پس منظر میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح اگر صحرائی علاقے کا کوئی پودا دکھانا مطلوب ہے تو وہاں ماحول بھی صحرائی پیدا کیا گیا ہے اور اس کے لئے خاص طور سے ریت بھی اس علاقے سے منگوا کر استعمال کی گئی ہے۔

افریقی ممالک میں پیدا ہونے والے پودے اور درختوں سے متعلق جو ہال
مخصوص ہے وہاں جھیل میں لگے ہوئے پودے اور جنگلی مناظر بھی دکھائے گئے ہیں
اور ایسے شاندار کہ مصنوعی پر حقیقی کا گمان گزرتا ہے۔

پودوں کی پرورش پرداخت کے لئے ہر ہال کا درجہ حرارت متعلقہ ملک کے موسم
کی نسبت سے مخصوص رکھا گیا ہے اور آپ کو متعلقہ ہال میں داخل ہوتے ہی مخصوص
قسم کی گرمی یا سردی کا احساس بھی ہوگا ہوا کا تاثر پیدا کرنے کے لئے چھتوں سے پنکھے
لٹک رہے ہیں۔

ایک اور قابل توجہ چیز یہاں کی آرائش و زیبائش ہے پودے کو کہیں ہاتھی کی شکل
میں تراشا گیا ہے کہیں گھوڑے کی شکل میں کہیں مور بنا دکھائی دیتا ہے تو کہیں بطخ، تراش
خراش اتنی عمدہ ہے کہ دور سے دیکھنے پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے۔ اس باغ کی تاریخ
بہت قدیم ہے اور جنگل نما باغ میں جا بجا پہاڑیاں اور درختوں کے جھنڈ دکھائی پڑتے
ہیں ہر پہاڑی اور جھنڈ کے ساتھ ایک الگ داستان وابستہ ہے جس کی تفصیل اس کے
سامنے ایک پتھر پر درج ہوتی ہے پتھر کی ایک بڑی سل پر قریباً سو سال پہلے کی بنی ایک
گھڑی موجود ہے جس سے سمت اور وقت کا صد فی صد صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

باغ میں داخلے کے لئے جو ہال مخصوص ہے اس کے کونے میں ایک منی سینما ہ
بنایا گیا ہے جہاں باغ میں موجود مختلف اشیاء کی مکمل فلم مسلسل دکھائی جاتی ہے تا
آپ اپنی دلچسپی کے حصے سے متعلق صحیح راہنمائی حاصل کر سکیں۔ ہفتے کے مخصو
ایام میں یہاں رات کے پہلے پہر روشنی اور آواز کے خوبصورت امتزاج سے مختل
پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں جن کی مدد سے اس جنگل میں موجود کھنڈرات
تاریخ اسی زمانے کا سا ماحول پیدا کر کے بیان کی جاتی ہے رات کافی دیر گئے ہم یہ شو
کر واپس لوٹے۔

امریکہ میں دن اور رات کے درمیان کوئی حد فاصل بظاہر دکھائی نہیں دیتی رات
یا دن کے کسی بھی حصے میں ہائی وے پر چلے جائیے زندگی اپنے پورے جوبن کے ساتھ
رواں دواں دکھائی دیتی ہے صرف یہ ہے کہ رات ہیوی وہیکلز کی نقل و حمل بڑھ جاتی
ہے یہاں ایک بڑی دنیا کے اندر چھوٹے چھوٹے بے شمار جہان آباد ہیں اور ہر جہان
اپنے اندر اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے ہے۔

کسی شاپنگ سنٹر میں گھسنے کے بعد آپ خود کو الگ دنیا کا باسی جاننے لگیں گے ان
سٹورز میں دنیا کی مہنگی ترین اشیاء بھی ہیں اور عام آدمی کی قوت خرید کے مطابق اشیاء
بھی انہی میں موجود ہیں۔

امریکیوں کے پاس یا تو دولت بہت زیادہ ہے یا پھر شاپنگ کا جنون ہے کسی بھی
امریکی کو آپ کسی بھی سٹور یا گروسری سے باہر نکلتے دیکھیں گے تو وہ بنڈلوں سے لدا
پھندا دکھائی دے گا۔

ملکی اور بین الاقوامی حیثیت کے بے شمار سٹورز ایسے ہیں جہاں ضروریات زندگی
کی قریباً ہر شے ایک ہی سٹور سے دستیاب ہو جاتی ہے ایسے کسی ایک سٹور میں داخل
ہونے کے بعد کھانے پینے کی اشیاء سے لے کر سٹیشنری، کپڑے، جوتے، میک اپ
غرض عام زندگی میں استعمال ہونے والی ہر شے موجود ہوتی ہے۔

ایک ایک چیز کی اتنی بے شمار اقسام ہیں کہ انتخاب ایک مسئلہ بن جاتا ہے ایک ہی
طرح کی سینکڑوں قسم کی پتلونیں، سینکڑوں قسم کی قمیصیں، سینکڑوں قسم کے جوتے
آپ کی نگاہ انتخاب کے لئے چیلنج بن جاتے ہیں بچوں کے لئے مخصوص کسی شاپنگ
سنٹر میں گھس جائیے کئی ایکڑ رقبے پر پھیلے سنٹر میں بچوں کی اتنی بے شمار اقسام کے
ملبوسات اور ضروریات زندگی کی اشیاء موجود ہیں کہ دیکھئے تو دیکھتے ہی رہ جائیے گا۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ قریباً ہر دوسرے بڑے سٹور کے مالک یہودی ہیں۔

شاپنگ کے معاملے میں ہندو کا تعصب ہر جگہ نمایاں ہے کوئی ہندو خواہ وہ گزشتہ 20 سال سے امریکن شہری بن چکا ہے وہ بھی پکا نیشنلسٹ ہے یہ لوگ اپنے انڈین سٹورز سے چیزیں خریدنے کے لئے سو میل کی ڈرائیو کرتے ہیں لیکن کوشش یہی کرتے ہیں کہ اپنے سٹور سے سامان خریدیں۔

یہ بات قابل افسوس ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے جو اپنے پاکستانی سٹورز کی طرف منہ کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ مقام افسوس ہے کہ ہم جو عالمگیر اخوت اسلامی کے داعی بنے ہوئے ہیں اپنے اندر قومی سوچ کو بھی ڈھنگ سے اجاگر نہیں کر سکے۔

فلاڈلفیا امریکہ کا پہلا دارالحکومت ہے۔ واشنگٹن کو اس کے بعد دارالسلطنت بننے کا اعزاز حاصل ہوا جب امریکیوں نے آزادی حاصل کی تو فلاڈلفیا کے گرجا گھروں میں خوشی اور مسرت کی گھنٹیاں اتنی شدت سے بجائی گئیں کہ آج "بیل آف پنسلوینیا" ایک یادگار کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

"بیل آف پنسلوینیا" اس عظیم الشان گھنٹی کا نام ہے جس کو خوشی اور مسرت سے بے قابو ہو کر امریکیوں نے اتنی زور زور سے بجایا تھا کہ یہ گھنٹی ٹوٹ گئی آج یہ ٹوٹی ہوئی گھنٹی ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے فلاڈلفیا میں محفوظ ہے جسے دیکھنے کے لئے دنیا بھر کے سیاح ادھر کا رخ کرتے ہیں جو لوگ نیویارک "لبرٹی ویلیج" دیکھتے ہیں وہ "بیل آف پنسلوینیا" بھی دیکھنے جاتے ہیں جسے آزادی کی گھنٹی کہا جاتا ہے۔

امریکہ میں کچھ کھیل جنون کی حد تک مقبول ہیں ایک تو "فٹ بال" دوسرے ریسلنگ، بیس بال اور باسکٹ بال وغیرہ خیال رہے کہ امریکہ میں فٹ بال پاؤں سے نہیں ہاتھوں سے کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل کو امریکی جنون کی حد تک پسند کرتے ہیں کسی بھی سٹیڈیم میں چلے جایئے وہاں میچ کے ٹکٹ ایک ہفتے پہلے ہی بک ہو چکے ہوتے ہیں اور کھیل کے میدان میں جوش و خروش کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

اس کھیل کے کھلاڑی ضروری کپڑے اور ہیلمٹ پہن کر میدان میں اترتے ہیں وراپنی جسمانی طاقت اور پھرتی کے بل بوتے پر میدان مار لیتے ہیں۔ بچپن سے فٹ

بال بائی پاور کا محاورہ سنتے آئے تھے اس کی صحت اور سچائی کا یقین اس کھیل کو دیکھ کر ہی ہوتا ہے۔

مٹھیاں بھینچ کر اور گلا پھاڑ کر اتنی زور زور سے چلاتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے سکے۔ میچ جتنی دیر جاری رہتا ہے ایک طوفان سا تماشائیوں کی صفوں میں ہلچل مچائے رکھتا ہے لوگ ہم آواز ہو کر اپنی اپنی ٹیموں کے لئے تیار شدہ گیت کورس کی شکل میں گاتے ہیں۔

یوں جانئے کہ ایک جذب کا عالم تماشائیوں پر طاری رہتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

میں اپنے عزیزوں کے ساتھ کشتیوں کے مقابلے دیکھنے کے لئے مقامی سٹیڈیم پہنچا جہاں مجھے معلوم کرنا تھا کہ اس میچ میں کون کون سے پہلوان حصہ لے رہے ہیں۔ طاہرہ نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور میں باہر نکل کر ایک نیگرو کی طرف بڑھا ج نزدیک ہی کھڑا تھا میں اس سے صرف پہلوانوں کی تفصیل دریافت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہاں بھی ٹکٹوں کی بلیک ہوتی ہے اور ا دھندے میں بھی اپنے نیگرو بھائی پیش پیش ہیں یہاں دراصل امریکن پولیس مستعدی کا وہ شاندار مظاہرہ میں نے دیکھا کہ حیرت گم ہو کر رہ گئی۔

جس نیگرو سے میں نے دریافت کیا تھا وہ دراصل ٹکٹ بھی بلیک کرتا تھا خدا جا اس بھرے پرے ہجوم کے کس کونے میں پولیس کی گاڑی اس کی تاک میں کھڑی جیسے ہی اس نے مجھے پہلوانوں کے نام بتائے ایک زناٹے سے میرے دائیں ہاتھ پولیس کی تیز رفتار گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز آئی دوسرے ہی لمحے پولیس میرے سر پر کھڑی تھی جس کی دائیں کھڑکی سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس متعلقہ نیگرو کی جیکٹ کے کالر کو مضبوطی سے تھام لیا پولیس والے "مجھے گاہک"

تھے انہوں نے نیگرو کی تلاشی لے کر اس سے آٹھ دس ٹکٹ برآمد کر لئے پھر مجھے پوچھا میں نے کہا صاحب ہونہ مجھے ٹکٹ درکار تھا نہ یہ بے چارہ ٹکٹ میرے پاس فروخت کر رہا تھا بس یونہی کسی پرانے گناہ کی پاداش میں قابو آ گیا کیا مجال جو پولیس نے مجھ سے اگلا کوئی سوال کیا ہو۔

انہوں نے نوگرفتار کو اپنے ساتھ سوار کیا اور میرا شکریہ ادا کر کے اپنی راہ لی۔

یوں تو امریکہ کے ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ایسی شے آپ کو دکھائی پڑے گی جو عجوبہ روزگار ہو خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے کسی ترقی پذیر ملک کے شہری کو کسی ترقی یافتہ اور وہ بھی "سپر پاور" ملک میں بہت کچھ ایسا دیکھنے کو ملتا ہے جو اس کے لئے تو نیا ہوتا ہے لیکن ترقی یافتہ دنیا کے لئے پرانا ہو چکا ہوتا ہے۔

○

فلاڈلفیا کا فرینکلین انسٹی ٹیوٹ سائنس میوزیم بھی ایک ایسا ہی میوزیم ہے۔ جو سائنس کے طالب علم کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔

اس چار منزلہ میوزیم میں مختلف موضوعات کے حوالے سے بلاک ترتیب دیئے گئے ہیں۔ پہلی منزل پر سائنس ایڈیٹوریم میں سائیکل والے سیکشن میں دنیا کی قدیم اور جدید ترین سائیکل سے ایجادات کی کہانی کا آغاز کیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ ہی کمیونیکیشن کا شعبہ ہے جہاں بیٹھ کر آپ اپنے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا کر اور سامنے نصب کمپیوٹر پر نظریں جمائیں تو آپ کو نظام پیغام رسانی کی پوری سمجھ آ جاتی ہے۔

اگر آپ دو گھنٹے اس کمپیوٹر کلاس روم میں بسر کریں تو آپ کو کم از کم کمپیوٹر کی مبادیات کا علم ہو جاتا ہے۔ یہیں ایک پلینٹریم میں اجرام فلکی کی فلم دکھائی جاتی ہے یہاں سیاروں کی تفصیلات بہم پہنچانے کے علاوہ خدا کی پیدا کردہ اس عظیم کائنات اور بہت سی دیگر دنیاؤں کا نظارہ بھی ہوتا ہے۔

دوسرے فلور پر پہلی اور انتہائی متاثر کن چیز "دل" ہے۔ انسانی دل کی ایک ایک شریان میں آپ بخوبی سفر کر سکتے ہیں۔ مٹی اور پتھر کی آمیزش سے تیار کردہ یہ "دل" یہاں آنے والے ہر سیاح کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ خون کہاں سے چلتا ہے اور کہاں کہاں سفر کرتا کہاں پہنچ جاتا ہے تمام تفصیلات یہاں دیکھ لیجئے۔

اسی فلور پر سائنس نیوز سنٹر میں آپ کو سائنس سے متعلق تازہ ترین معلومات کمپیوٹر کا ایک بٹن دبانے پر حاصل ہو سکتی ہیں۔ انرجی آئس لینڈ میں پانی کے ذریعے بجلی بننے کا منظر دیکھا جاتا ہے۔

پہاڑوں سے صحراؤں تک انرجی کے سفر کو بڑی خوبصورتی سے مصنوعی ماحول پیدا کر کے واضح کیا گیا ہے الیکٹرسٹی اینڈ الیکٹرونک سنٹر میں آپ برقیات کی مکمل تاریخ اور طریق کار سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ مختلف نوعیت کے چھوٹے چھوٹے تجربات کر کے ہر نظام سے متعلق ابتدائی نوعیت کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کو یہ علم ہو سکتا ہے کہ بجلی کیسے پیدا ہوتی ہے اور کس طرح اس کو روبہ عمل لایا جاسکتا ہے۔

دوسرے فلور پر ہی ایوی ایشن ہسٹری کا شعبہ موجود ہے یہاں ابتدائی زمانے کے جہازوں سے لے کر جدید ترین سپر سانک طیاروں تک کے ماڈل موجود ہیں اور بتایا گیا ہے کہ قدم بہ قدم کس طرح اس میدان میں ترقی کی منازل طے کی گئی ہیں۔ اسی فلور پر نیشنل میموریل میں تاریخی نوعیت کی سائنسی اشیاء رکھی گئی ہیں۔

تیسری منزل پر ایجادات کا تھیٹر، زمینی نوعیت کی معلومات کا شعبہ جس کے ذریعے زلزلے، آتش فشاں اور زمین کی سطح کے نیچے ہونے والے مختلف عوامل سے آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے موجود ہیں۔

اس فلور پر پانی سے متعلق معلومات کا شعبہ بھی قائم ہے جہاں پانی کے حصول کی مختلف تراکیب کا عملی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

چوتھی منزل پر ریڈیو، سیارگان حسابیات کے شعبے قائم ہیں اور ساتھ ہی کلاس روم موجود ہے جہاں داخلہ لینے والوں کو باقاعدہ تعلیم و تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اس میوزیم میں جابجا چھوٹے چھوٹے کیبن میں رکھے ٹی وی سکرین پر مختلف نوعیت کے معلوماتی پروگرام ہر وقت جاری رہتے ہیں۔

یہاں پر دکھائی جانے والی بارہ منٹ کی فلم "سنہ 2000 کے لوگ" کو شاید ہی یہاں آنے والا کوئی سیاح مس کرتا ہو۔

امریکہ آکر صدارتی محل دیکھنا ایک فطری بات ہے۔ رزاق ٹیکسی چلاتا تھا یوں تو امریکہ میں ہر شخص مشین کی طرح کام کرتا ہے لیکن ٹیکسی ڈرائیور شاید دن میں چار گھنٹے ہی بمشکل آرام کرتے ہیں۔ دن رات ڈالر کمانے کی ہوس ان کی جان کو آئی رہتی ہے۔ رزاق کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ لیکن اس کی وضع داری ابھی تک قائم تھی۔ حالانکہ میں اسے "ڈسٹرب" نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے بضد ہونے پر اس کے ہاں جانے اور واشنگٹن میں وائٹ ہاؤس دیکھنے کی ٹھانی۔

فلاڈلفیا سے بذریعہ ریل کار سفر کا فیصلہ ہوا۔ طاہرہ مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آئی۔ ہم نے ٹکٹ خریدا گاڑی آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ کچھ دیر اندر انتظار کرتے رہے۔ پھر باہر پلیٹ فارم پر چلے گئے۔ یہاں پلیٹ فارم کا عام طور پر رواج نہیں۔ جب ٹرین آتی ہے تو زمین پر لکڑی کے بنے ہوئے قدمچے رکھ دیئے جاتے ہیں اور ٹرین پر اترنے چڑھنے میں گارڈ آپ کی مدد کرتا ہے۔ گاڑی آئی میں نے طاہرہ کو خدا حافظ کہا اور گارڈ کو اپنا ٹکٹ دکھایا۔ اس نے ایک سیٹ میرے لئے مخصوص کر دی اور ہم "خلیج کی ہوا" نامی ٹرین میں داخل ہو گئے۔ سیٹیں کافی کشادہ اور آرام دہ تھیں۔ سیٹ بڑھ کر ایک چھوٹا سا بستر بھی بن جاتی تھی۔ اندر درجہ حرارت بھی مناسب تھا۔ اس لئے میں نے اپنا رک سیک اور جیکٹ اتار کر اوپر رکھا اور اپنا ناول پڑھنا شروع کر دیا، اکثر لوگ کمبل اوڑھے سو رہے تھے ہمیں بھی ایک تکیہ مل چکا تھا۔

ٹرین میں ہر مسافر کی سیٹ کے اوپر ایک خانے میں گارڈ اس کی منزل کا نام لکھ کر چلا جاتا ہے پھر جب اس کا اسٹیشن آنے والا ہوتا ہے تو گارڈ آکر اسے بتلا دیتا ہے۔ یوں دوسرے مسافروں کی نیند خراب نہیں ہوتی۔

ساڑھے دس بجے واشنگٹن پہنچ گئے۔ واشنگٹن کا ریلوے اسٹیشن دنیا کے چند خوبصورت ترین ریلوے اسٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ ہم نے سامان اٹھایا اور انتظار گاہ میں آ گئے۔ رزاق مسکراتا ہوا نظر آ گیا اور ہم سب وے پر بیٹھ کر پارکنگ کی طرف چل دیئے۔ وہاں سے اس نے اپنی ویگن نکالی اور ہم ورجینیا پہنچ گئے۔ یہاں رزاق اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ اگلے روز اسے میرا اہم سفر ہونا تھا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میٹرو اسٹیشن سے ٹرین میں بیٹھا اور ٹرین مجھے سیدھی فیڈرل ٹرائینگل لے آئی، باہر نکل کر وائٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں تقریباً دو میل لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا اندر جانے کا پرمٹ صبح آٹھ بجے ملتا ہے اور اب تو لوگوں کی تعداد بھی پوری ہو چکی ہے اس لئے کھڑکی بھی بند ہو چکی تھی ہم نے صدر سے ملنے کو اتنا ضروری نہ سمجھا اور سامنے کھڑے ہو کر اپنی دو چار تصویریں بنوائیں تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

سامنے ہی واشنگٹن مانومنٹ تھا۔ وہاں بھی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی جو سانپ کی طرح مانومنٹ کے گرد بل ڈالے ہوئے تھی۔ ہم بھی لائن میں کھڑے ہو گئے۔ پون گھنٹے بعد ہماری باری بھی آ گئی اور ہم لفٹ میں بیٹھ کر اوپر مانومنٹ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہاں کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ لیکن چاروں طرف سے واشنگٹن کے خوبصورت مناظر واقعی دیکھنے کے قابل تھے۔

واشنگٹن مانومنٹ کے قریب ہی باقی میوزیم اور آرٹ گلیریز بھی ہیں۔ بلکہ یہ ایک سڑک ہے۔ جس کے دونوں طرف بے شمار میوزیم وغیرہ ہیں۔ ایک کونے پر واشنگٹن مانومنٹ، وائٹ ہاؤس اور لنکن میموریل ہیں اور دوسرے کونے پر کیپیٹل ہل،

یوں امریکیوں کے تمام قابل دید مقامات کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے۔

یہاں سے نکلا تو ساتھ ہی میوزیم آف ٹیکنالوجی تھا۔ جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا ارتقاد کھایا گیا تھا۔ کمپیوٹر اپنی ابتدائی شکل میں، پرانے ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ، حتیٰ کہ ایک جگہ ایٹم بم بھی پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف پرانی طرز کے سینما ہال بنے ہوئے ہیں۔ جہاں مختصر دورانئے کی پرانی فلمیں چل رہی ہوتی ہیں۔ غرض اتنا وسیع اور مکمل میوزیم تھا کہ اسے پوری طرح دیکھنے کے لئے کم از کم ایک ہفتہ درکار تھا۔ ایک جگہ کمپیوٹر پڑے ہوئے تھے۔ یہاں سے آپ دنیا بھر کی تازہ خبریں معلوم کر سکتے تھے۔

ساتھ ہی قومی ورثے کا میوزیم تھا، وہاں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ایک ڈینو سار سے سامنا ہوا۔ یہاں دنیا کے ارتقا کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ لاکھوں سال پہلے کا سمندر اور اس وقت کے جانور اس کے بعد انسانی ارتقا کے مختلف مناظر تھے دوسری منزل پر ایک کونہ جانا پہچانا نظر آیا۔ قریب آئے تو معلوم ہوا کہ اس کونے کو پاکستانی بازار کا نام دیا گیا ہے۔ کسی گاؤں کی دکان کا منظر تھا۔ لیکن پھر بھی پاکستان کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کیونکہ دوسرے میوزیمز میں تو پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ بریکٹ کر کے کام چلا دیا جاتا ہے۔

قومی ورثے کے میوزیم سے نکل کر نیشنل ائرو سپیس میوزیم میں داخل ہوئے۔ لیکن میں سب سے پہلے آئن سٹائن پلانیٹیریم میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ش شروع ہوا۔ دنیا کی ابتدا کا منظر دکھایا گیا۔ پھر مختلف سیارے، یہ ایک ایسا نظارہ تھا جو واقعی دل کو موہ لیتا ہے۔

ہم نے ساڑھے پانچ بجے شروع ہونے والے ڈبل فلم شو کے ٹکٹ بھی خریدیا لئے۔ کوئی اندازہ تو نہ تھا کہ وہ کیا دکھائیں گے لیکن لوگوں کی لمبی قطار سے اندازہ لگا کہ کچھ تو ہو گا۔

ساڑھے پانچ بجے تھیٹر میں پہنچے۔ پانچ سو آدمیوں کے لئے جگہ تھی، لیکن ہر سیٹ اس طرح تھی کہ آپ کے نظارہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، سکرین تقریباً عام سینما سکوپ سینما کی سکرین سے پانچ گنا بڑی تھی۔ ڈیجیٹل ساؤنڈ کا انتظام تھا۔ پہلی فلم شروع ہوئی تو یہ ایک ایسا نظارہ تھا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنی بڑی سکرین، اتنی صاف اور واضح تصویر آپ کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ آپ خود پرواز کر رہے ہیں اور بعض فعہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورا ہال جھک رہا ہے، مڑ رہا ہے، اڑ رہا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی کے یک ایسے سلسلے کی کڑی تھا جو امریکہ میں بار بار دیکھنے کو ملے لیکن جس کو الفاظ میں بیان رنا ممکن نہیں اسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد زمین کے بارے میں ایک فلم شروع ہوئی۔ جس میں کہیں تو بڑے ۓ آتش فشاں آگ اگل رہے تھے اور کہیں گہرے سمندروں کی تہہ کے نظرے تھے۔ ایسے ہوش ربا اور دلچسپ نظاروں میں کسے وقت کا ہوش رہتا ہے۔ جیسے ہی شو ختم وا اور میں نے وقت کا اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ وقت تو بہت کم رہ گیا ہے۔ اس لئے دوڑ ائی اور قریب کے میٹرو اسٹیشن سے اپنی گاڑی پکڑ لی۔

اگر آپ کو واشنگٹن جانے کا موقع ملے اور آپ کے پاس صرف چند گھنٹے ہوں تو ہرا مشورہ ہے کہ صرف ائرو سپیس میوزیم میں آکر آئن سٹائن پلانیٹیریم اور اگر وقت ت کم ہے تو سیموئل پی تھیٹر جو میوزیم کے اندر ہی واقع ہے جتنی زیادہ فلمیں دیکھ سکتے ں دیکھ لیں۔ یہ ایک ایسا نظارہ ہے جو آپ بہت کم جگہوں پر کر سکیں گے۔ لیکن یاد ہے کہ اگر آپ کو موشن سکنس کا مسئلہ ہے تو پھر یہ دیکھنے میں ذرا احتیاط کریں کیونکہ ں سے تاثر یہی ہوتا ہے کہ آپ خود پرواز میں شامل ہیں۔

ساڑھے سات بجے ہم اپنے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ باہر نکلتے وقت ٹکٹ مشین میں ڈالا وہ باہر واپس آگیا اور دروازے نے کھلنے سے انکار کر دیا۔ میں نے دو تین دفعہ

دوسرے دروازوں میں بھی ٹرائی کیا لیکن نتیجہ یہی رہا۔ اب مجھے پریشانی ہوئی کہ یہ
چکر ہے۔ ایک کالے کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ آخر وہاں پر موجود ایک آدمی نے
چونکہ آپ نے جو ٹکٹ خریدی ہے وہ رش کے اوقات میں نہیں چلتی، اس لئے اب آ
کو کچھ مزید پیسے ڈالنے ہوں گے۔ تقریباً ایک ڈالر مزید خرچ کیا اور یوں ہم باہر نکلے۔

اگلے دن نہا دھو کر تیار ہوا۔ رزاق کام سے واپس آیا، ہم نے کیک کے ٹکڑے
میں ڈالے اور فروٹ یوگرٹ کے ڈبے ہاتھوں میں پکڑے اور کھاتے کھاتے می
اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں سے کل والی ٹرین لی اور پھر سیدھا فیڈرل ٹرائینگل پہنچے۔ امی
نہ تھی لیکن پھر بھی سوچا چلو آج پھر وائٹ ہاؤس ٹرائی کر لیتے ہیں۔ ہمارا کوئی ل
امریکہ کا چکر لگا آتا ہے تو لوگوں میں اس کے اقتدار میں آنے کی قیاس آرائیاں شر
ہو جاتی ہیں۔ ہم وائٹ ہاؤس کے اندر جانے کا چانس لے لیں۔ دوستوں پر ذرا رع
ہی پڑے گا۔

جب وہاں پہنچا تو رش نہیں تھا اور پرمٹ والی کھڑکی کھلی تھی۔ ہم نے دوڑ لگائی
پرمٹ لیا۔ ہمارے ہٹتے ہی بی بی نے کھڑکی بند کر دی۔

لائن بہت چھوٹی تھی۔ پانچ منٹ کے بعد ہم وائٹ ہاؤس کے اندر تھے۔ وہی و
ہاؤس جہاں چھوٹی قوموں کے بارے میں فیصلے ہوتے ہیں اور جس کے قربت
اظہار سے ان ملکوں میں اقتدار کے تخت مضبوط کئے جاتے اور الٹائے جاتے ہیں۔ ن
نے ہماری تلاشی لی البتہ مشین میں سے ضرور گزارا۔ وائٹ ہاؤس اندر سے واقعی
خوبصورت تھا۔ لیکن سنا ہے ہمارے سیاستدانوں کے گھر اس سے بھی زیادہ عالی
ہوتے ہیں۔

باہر نکلے تو لنکن میموریل کی طرف چلے۔ وہیں ساتھ ہی ویت نام میں م
والوں کے ناموں کی دیوار بھی ہے۔ کئی لوگ اپنے عزیزوں کے نام کے سامنے کھ

ہو کر آنسو بہا رہے تھے۔ کہیں پھول پڑے ہوئے تھے۔ اس کے باہر ایک دو سٹالوں پر
خلیج کی جنگ کے بنیان اور دوسرا یادگاری سامان بھی بک رہا تھا۔ ایک بنیان پر پاکستان کا
جھنڈا بھی نظر آیا، لیکن اکیلا نہیں بلکہ تیس کے قریب اتحادی ملکوں کے ساتھ۔

لنکن میموریل ایک بڑی سفید رنگ کی عمارت ہے جو واشنگٹن مانومنٹ اور ایک
لمبے تالاب کے بعد آتی ہے اور اس کے اندر لنکن کا ایک بہت بڑا مجسمہ اور امریکی
آئین سے متعلق چند یادگاریں موجود ہیں۔

میں میٹرو سے سیدھا واشنگٹن یونین اسٹیشن آگیا رزاق نے الوداعی تحفہ کے طور پر
ایک خوبصورت ڈبے میں بند ایک ٹی شرٹ دی، ٹی شرٹ دیکھ کر میں نے یہ اندازہ لگا لیا
تھا کہ یہ کوئی خاص ہی چیز ہے لیکن بعد میں طاہرہ نے اسے دیکھ کر بتایا کہ یہ تو برکس
برادرز کی شرٹ ہے اور یہ نیویارک کا اتنا مہنگا سٹور ہے کہ صرف ڈاکٹر اور وکیل ہی
خریداری کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے تمام سفر کی ٹکٹیں بنوالی تھیں اور اب آرام سے
یونین اسٹیشن کی سیر کر رہا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ بہت خوبصورت ہے۔
اس کی نچلی منزل پر سینکڑوں کی تعداد میں کھانے پینے کے چھوٹے چھوٹے ہوٹل بنے
ہوئے ہیں اور وہاں دنیا کے تقریباً ہر ملک کا کھانا ملتا ہے۔

ڈیڑھ بجے ٹرین چلی۔ راستہ بھر آرام سے اخبار پڑھتا رہا پانچ بجے کے قریب
فلاڈلفیا واپس پہنچ گیا۔

واشنگٹن سے دریائے پوٹامک کی طرف جائیے تو ایک خوبصورت سٹیٹ ورجینیا نام کی آتی ہے جہاں ماؤنٹ ورنر پر امریکی صدر جارج واشنگٹن کا گھر اور باغات واقع ہیں جنہیں اب ایک تاریخی مقام کا درجہ حاصل ہے۔

یہاں جنگل کی خاموشی میں پہاڑی گزرگاہ پر ایک خوبصورت شہر آباد ہے جہاں بلاشبہ امریکی متمول شخصیات کا قیام ہے پہاڑی بھول بھلیوں میں واقع اس شہر کے ایک خوبصورت بنگلے میں سردار آتما سنگھ کے گھر کے باہر سکھوں کا "نشان صاحب" نصب ہے اور دن اور رات میں دو تین مرتبہ پولیس کی پٹرول پارٹی اس کی خبر لینے کے لئے اس نشان صاحب کے سامنے ضرور رکتی ہے۔ خلاف توقع آپ کو اس کے گھر کا دروازہ کھلا ملے گا۔ علاوہ ازیں بھی وہ حفاظتی اقدامات کو اہمیت نہیں دیتا جو امریکہ میں اچنبھے کی بات ہے۔

"زندگی کا ایک لمحہ پہلے یا بعد میں کسی کو فالتو میسر نہیں آتا پھر یہ بات بھی ہے کہ میری مذہبی تعلیمات کے مطابق میرے مرنے جینے پر میرا نہیں بلکہ پرماتما کا اختیار ہے پھر میں اس کی فکر کیوں کروں۔" وہ اپنے ملنے والوں سے عموماً یہ بات ضرور کہتا ہے۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ آتما سنگھ کی زندگی کو خطرہ لاحق نہیں تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے آپ کو اکثر امریکی صحافی اس کے متعلق یہ رائے دیں گے آتما کا تعلق بظاہر سکھوں کی کسی بڑی تنظیم سے نہیں۔ لیکن اس کے متعلق بھارت کی حکومت

یقین رکھتی ہے کہ مشرقی پنجاب میں چلنے والی تحریک خالصتان کی نبض پر اس کی مضبوط گرفت موجود ہے۔

آتما سنگھ کے گھر میں داخل ہوتے ہی جس ڈرائنگ روم میں آپ کو بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے وہاں گورونانک دیو کی ایک بڑی پینٹنگ کے ساتھ دربار صاحب امرتسر کی تصویر اور دوسرے کونے پر گورو گوبند سنگھ کی تصویر نظر آئے گی۔

کسی سکھ کے گھر میں آپ کو اپنے گورو کی تصویر کے ساتھ مسلمان سیاسی لیڈر کی تصویر نظر نہیں آئے گی لیکن یہاں اس نے اپنے گورو کے ساتھ قائداعظم کی تصویر لگا رکھی ہے۔ اس نے مجھے کہا میری دوستی قائداعظم سے نہیں ان کے اصولوں سے تھی اور میری موت کے بعد بھی اس طرح زندہ اور برقرار رہے گی مجھے اس پر فخر ہے

آتما سنگھ ایک وضع دار اور روایت پرست انسان ہے سکھی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنا اس کی خواہش رہتی ہے جس کا اظہار اس کے گھر کے ایک کونے میں بنے چھوٹے سے گوردوارے سے ہوتا ہے۔

اس کمرے میں روزانہ کیرتن ہوتا ہے۔ دربار صاحب ایک منقش چوکی پر سجا ہوا موجود ہے یہاں ایک خاصے کی چیز گورونانک دیو کی وہ تصویر ہے جو آتما سنگھ کے ایک مسلمان آرٹسٹ دوست نے اسے 50ء میں بنا کر دی تھی۔

آتما سنگھ سے میری دوستی کیسے ہوئی؟

بڑی مختصر کہانی ہے---

85ء میں شاید پہلی مرتبہ وہ بطور امریکن شہری پاکستان آیا سر راہے میری اس سے ملاقات ہو گئی۔ میں ان دنوں سکھوں کی تحریک آزادی پر مضامین لکھا کرتا تھا۔ شاید آتما سنگھ نے کسی اخبار میں میرا مضمون پڑھا تھا۔

یہ اخبار اس نے اپنے ہوٹل میں پڑھا تھا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ وہ اردو زبان پر

کسی بھی ماہر لسانیات سے زیادہ عبور رکھتا تھا۔ مضمون پڑھ کر اس نے اخبار کے دفتر فون کیا اور اس طرح مجھ سے رابطہ کرنے کے بعد ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

میری خواہش پر وہ اپنی بیٹی پرجیت کور کے ساتھ جو واشنگٹن میں ڈاکٹریٹ کر رہی تھی مجھے ملنے میرے گھر چلا آیا۔

ستر سال کی عمر کا آتما سنگھ کسی نوجوان کی طرح مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد بغل گیر ہوا اور آدھے گھنٹے کی گفتگو کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں کسی سکھ سے نہیں قائداعظمؒ کے کسی جانفروش شیدائی سے باتیں کر رہا ہوں۔

آتما سنگھ نے بتایا کہ 55ء میں وہ امریکہ آ گیا تھا کیونکہ ۷ ۴ء میں اس کی توقعات کے بالکل برعکس تقسیم ہندوستان ہوئی تھی۔ اس نے سکھوں کی تباہی کا ذمہ دار اپنے لیڈروں کو گردانا اور اپنا لیڈر قائداعظم کو قرار دیا۔

اپنے قیام لاہور کے دوران اس نے میری کتاب "خالصتان ماضی کا خواب مستقبل کی سچائی" اور میرے ناول "چناروں کے آنسو" کا مطالعہ کیا۔ تب یہ ناول شائع نہیں ہوا تھا ابھی زیر طبع تھا۔ آتما سنگھ مسودہ پڑھتے ہوئے بچوں کی طرح روتا رہا جس کے بعد ہمارے درمیان ایک عجیب سا تعلق بندھ گیا۔ وہ بضد تھا کہ میں اسے اپنا "دوست" سمجھوں اس کے بعد اس کی تحریک پر میں نے امریکہ اور لندن میں سکھوں کے پرچوں میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ افسوس میرا دوست 93ء میں میرا ساتھ چھوڑ گیا---!

حالانکہ اس نے مجھ سے سو سال جینے کا وعدہ کیا تھا۔

ساری زندگی دودھ چائے کے علاوہ کسی اور مشروب کو حرام سمجھنے والا آتما سنگھ بڑا جی دار تھا۔ خالصتان نواز تحریکوں کی طرف سے نکلنے والے جلوسوں میں وہ پیش پیش رہتا لیکن کسی بھی سکھ جتھے بندی سے اس کا تعلق نہیں تھا۔

واشنگٹن میں اس کے دو "گیس سٹیشن" تھے جہاں آتما سنگھ کا بیٹا امریک سنگھ اس کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

موت سے قریباً تین ماہ پہلے جب ڈاکٹر پرجیت کور نے مجھے بتایا کہ اس کی ماں مر گئی ہے تو مجھے دکھ ہوا کہ مسز آتما میری بھی ماں بنی ہوئی تھی جس کا ثبوت وہ مہینے میں ایک آدھ ٹیلی فون کر کے مجھے دیتی رہتی تھی۔

خدا جانے اسے ہارٹ اٹیک کیسے ہو گیا؟

میں نے اس کی ماں کی موت پر افسوس کے لئے جب آتما سنگھ کو فون کیا تو اس نے مجھے کہا کہ شاید اب وہ اپنا سو سال تک زندہ رہنے کا وعدہ پورا نہ کر سکے---

مجھے اس بات سے دھچکا سا لگا۔

ہونی شدنی--- ستر سال کے سردار آتما سنگھ کو اس کی جیون ساتھی تین ماہ بعد ہی اپنے ساتھ لے گئی---

○

آتما سنگھ کے گھر میری اور طاہرہ کی آمد پر ایک جشن سا برپا تھا۔ ڈاکٹر پرم جیت کا خاوند ترلوک سنگھ آتما سنگھ اور ماں جی ہمارے لئے دیدہ دل فرش راہ کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہماری پذیرائی اپنوں سے بڑھ کر کی۔ طاہرہ کے بچوں کو پرم جیت اپنی گاڑی میں سیر کروانے لے گئی اور میں ساری رات آتما سنگھ سے باتیں کرتا رہا۔ اگلے روز اس نے میری ملاقات کا اہتمام ڈاکٹر پیٹر گلبرائستھ سے کیا ہوا تھا جو مشہور کتاب "ڈاٹر آف ایسٹ" Daughter of East کا مصنف ہے۔

○

امریکی سینٹ میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکن دونوں کے ساتھ اس کے تعلقات مثالی تھے۔ اس نے اپنی حد تک امریکی اقتدار کے ایوان میں سکھوں کے مسئلے کو زندہ

رکھا ہوا ہے پیٹر گالبرائتھ سے بھی میری ملاقات آتما سنگھ نے ہی کروائی تھی۔

پاکستانی وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو پر لکھی کتاب ڈاٹر آف ایسٹ دختر مشرق والے سے پیٹر گالبرائتھ کا نام خاصا معروف ہے۔ مسٹر گالبرائتھ کے والد اپنے زما کے مانے ہوئے سفارتکار تھے اور اپنی سفارتی زندگی کا زیادہ عرصہ انہوں نے بھار ہی میں گزارا بھارت نوازی کے لئے خاصے معروف رہے ہیں۔ ان کے صاحبزاد مسٹر پیٹر گالبرائتھ پر اپنے والد کی سیاسی تعلیمات کا اثر بہت گہرا ہے اور وہ ذہنی طو اسی مکتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو ان کے والد کا تھا۔

پیٹر گالبرائتھ محترمہ بینظیر بھٹو کی شخصیت سے بہت متاثر ہیں انہیں محترمہ ساتھ رہ کر کام کرنے کا اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کا قریب سے جائزہ لینے کا م بھی ملا ہے 88ء کے انتخابات میں بھی وہ پاکستان میں موجود تھے ان سے ہونے گفتگو پیش ہے۔ خیال رہے کہ یہ بات چیت 88ء نومبر میں کی گئی تھی اور اسی پس میں سوال جواب بھی ہوئے تھے۔

سوال..... مسٹر گالبرائتھ سب سے پہلے میں اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات پر آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔

جواب..... میں دوران الیکشن پاکستان میں موجود تھا اور وہاں مجھے انتخابا نہایت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ میرے خیال میں جنوب ایشیاء میں اتنے جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کی کوئی مثال دیکھنے میں نہیں ملتی ایک لمبے عرصے بعد پاکستانی قوم کو ایک بہترین موقعہ ملا تھا کہ وہ جمہوری روایات کو اپنے ہاں مضب سکیں اور پاکستانیوں نے ثابت کر دکھایا کہ وہ جمہوریت کی اہل قوم ہیں بلاشبہ ان پر عرصہ تک ڈکٹیٹر شپ مسلط رہی لیکن وہاں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہونے کی

سے انہوں نے اس موقع پر عظیم روایات کا مظاہرہ کیا۔

جہاں تک جنرل ضیاء کی موت کے بعد انٹیرم گورنمنٹ کا معاملہ ہے تو کچھ خدشات بھی موجود تھے لیکن حکومت نے کسی ایک فریق کی حمایت کی بجائے انتخابات کو زیادہ سے زیادہ غیر جانبدار بنانے کی کوشش کی اور کسی سیاسی جماعت کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔

سوال..... مسٹر گالبرائتھ آپ ہماری نئی وزیراعظم سے قریبی رابطہ رکھنے کی وجہ سے جانتے ہوں گے کہ وہ کم عمر اور حکومتی معاملات میں زیادہ تجربہ کار بھی نہیں ہیں کیا آپ کے خیال میں اس خطے کی حساس نوعیت کے پیش نظر وہ کاروبار حکومت بخوبی چلا سکیں گی؟

جواب..... اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس سے پہلے محترمہ بینظیر بھٹو حکومتی ایوانوں میں نہیں بیٹھیں لیکن ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے انہوں نے اپنا لوہا منوایا ہے اور سیاست کے ہر کڑے امتحان میں پاس ہو چکی ہیں۔

یہاں مغربی دنیا میں انہوں نے جو پریس کانفرنسیں کی ہیں وقتاً فوقتاً جو سیاسی بیانات ان کی طرف سے جاری ہوتے رہے ہیں انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ سیاست میں نو آموز ہیں میرے خیال سے ان کی پارٹی بجا طور پر ایک جمہوری پارٹی ہے انہوں نے آمریت کے خلاف ایک لمبی لڑائی لڑی ہے اور بہت سی مشکلات سے کندن ہو کر نکلی ہیں۔

ان حالات میں یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ مسائل پر قابو پالیں گی یوں بھی انہیں جمہوری طاقتوں کی ہمدردی حاصل ہے جہاں تک فوج کا تعلق ہے تو فوج کے سربراہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ تمام قانونی تقاضے پورے ہوں انتخابات کروائے جائیں گو کہ یہ مشکل کام تھا لیکن فوج کی سرپرستی کی وجہ سے اور خصوصاً جنرل اسلم بیگ مرزا کی ذاتی

دلچسپی اور جمہوریت دوستی کی وجہ سے یہ کارنامہ انجام پا گیا گویا آپ کی فوج بھی اب
جمہوری قوتوں کی حمایت کر رہی ہے میرے خیال سے یہ بڑی اہم بات ہے۔

سوال...... آپ کے ہاں پریس میڈیا کی طرف سے ایک تاثر یہ بھی دیا جا رہا ہے
جیسے محترمہ بینظیر اور بھارت کی سابقہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی شخصیات قر
ایک جیسی ہیں اور انہیں مسز اندرا گاندھی سے تشبیہ دی جا رہی ہے۔

جواب...... میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا دونوں کے حالات کبھی ایک جیسے
نہیں رہے اگر آپ جائزہ لیں تو مسز اندرا گاندھی کی ایک پوزیشن شروع ہی ۔
کانگریس میں اپنے باپ نہرو کی وجہ سے رہی ہے اور وزیر اعظم بننے سے پہلے بھی انہیں
سرکاری وزارت کے منصب پر فائز رہنے کا موقعہ ملا ہے پھر انہیں اتنی کڑی آزمائشو
سے بھی نہیں گزرنا پڑا کیونکہ کانگریس بھارت کی عموماً مقبول جماعت ہی رہی ہے۔
اس کے برعکس محترمہ بینظیر بھٹو نے گیارہ سال کی طویل مسافت طے کی ہے
بڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ یہاں تک پہنچی ہیں ان کی جدوجہد
گاندھی سے بالکل الگ طرح کی ہے اس لئے دونوں کا موازنہ غلط بات ہے۔

سوال...... بھارت اور پاکستان دونوں میں نوجوان لیڈر شپ کی موجودگی میں آ
پاک بھارت تعلقات کا مستقبل میں کیا نقشہ دیکھ رہے ہیں۔

جواب...... بہت اچھا دونوں ممالک میں جمہوری حکومتیں ہیں نوجوان اور پر
قیادتیں موجود ہیں دونوں اچھے تعلقات کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔
یوں تو پاکستان اور بھارت دونوں حکومتوں کی طرف سے بیانات بھی دیئے ج
ہیں کہ انہیں اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہئے لیکن ماضی میں صورت حال کچھ ا
نظر نہیں آئی میرے خیال سے دونوں ممالک کی تاریخ میں ایسے دوستانہ مراسم
کرنے کا اس سے بہترین موقعہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔ اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ

کے مقابلے میں دونوں ممالک کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہو نگے۔ (ابھی
سارک کانفرنس نہیں ہوئی تھی) جلد ہی پاکستان میں سارک کانفرنس ہونے والی ہے
جس پر مسٹر راجیو گاندھی کی طرف سے پاکستان کے دورے کا اعلان بھی ہو چکا ہے یہ
بڑی خوش آئند بات ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس ملاقات کے بڑے دور رس
اثرات مرتب ہوں گے۔

سوال...... پاکستان میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ امریکہ نے کسی حد تک پاکستانی
انتخابات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے یوں بھی ڈیموکریٹس سے متعلق ہمارے
ہاں ایک خاص رائے بھی موجود ہے؟

جواب...... ڈیموکریٹس نے آپ کے انتخابات میں دلچسپی ضرور لی ہے۔ لیکن ہماری
دلچسپی صرف اس حد تک تھی کہ پاکستان میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہو جائیں اور
بس۔ آپ اسے نیک خواہش کہہ سکتے ہیں۔ اس کا یہ مقصد ہر گز نہیں کہ ڈیموکریٹس
نے کبھی عملی مداخلت کی ہے امریکہ کی کسی سیاسی جماعت نے کسی ملک کے معاملات
میں عملی مداخلت نہیں کی اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو غلط ہے ہماری دلچسپی پاکستان کی سیاسی
جماعتوں میں نہیں رہی ہماری دلچسپی پاکستان کی موجودہ قیادت ہے جس سے ہماری
ہت سی امیدیں وابستہ ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ مسز بے نظیر کی حکومت پاکستان
رامریکہ کے درمیان تعلقات کو مزید مضبوط اور مستحکم بنائے گی؟

سوال...... روس کے افغانستان سے نکل جانے کے بعد پاکستان اور امریکہ کی
ستی کی نوعیت کیا ہو گی۔

جواب...... میرے خیال سے ہماری دوستی میں دراڑ پڑے گی وہ غلط بات ہے
تان میں ایک جمہوری حکومت موجود ہے اور کسی بھی جمہوری حکومت سے
ملات طے کرنا نسبتاً آسان کام ہے ڈکٹیٹر شپ ہمارے لئے بہت پرابلم بنی ہوئی

تھی۔اب ایسی بات نہیں ہے ڈیموکریٹس جمہوری حکومتوں سے معاملات کو زیادہ پسند
کرتے ہیں ایک جمہوری حکومت کی موجودگی میں میرے خیال سے ہمیں اپنی دوستی کو
مضبوط کرنے اور نئے معاہدے کرنے کے اچھے مواقع میسر آئیں گے۔

سوال...... مسٹر گالبرائتھ آپ نے دونوں ممالک کی لیڈر شپ سے خاصی امیدیں
وابستہ کی ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر ہمیشہ ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے کیا
آپ کے خیال میں ہمیں اس نوجوان قیادت سے امید کرنا چاہئے کہ وہ اس مسئلے کا کوئی
مستقل حل تلاش کرلیں گے۔

جواب..... میں اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

○

شام ڈھل رہی تھی جب میں آتما سنگھ کی گاڑی میں واپس آیا۔ رات پھر ہماری
باتوں کی بھینٹ چڑھ گئی اور دوسرے روز دوپہر تک میں سوتا رہا----

اگلے روز میں نیویارک پہنچ گیا جہاں مجھے ان دو سکھ نوجوان سے انٹرویو کرنا تھا جو
ھارتی حکومت کو جنرل ودیا کے قتل کے سلسلے میں مطلوب ہیں اور یہ دونوں جعلی
سپورٹوں کے ذریعے جان بچانے کے لئے کینیڈا کے راستے امریکہ پہنچنے میں کامیاب
وگئے تھے۔اس ملاقات کا اہتمام بھی آتما سنگھ نے کیا تھا۔ جو اسی کا کام تھا عام حالات
ں ان تک رسائی ممکن نہیں تھی۔

ان کی گرفتاری بھی بھارتی حکومت کے کہنے پر عمل میں لائی گئی اور اب بھارتی
لومت نے ان پر مقدمہ چلانے کے لئے امریکی حکومت سے ان کی ڈیمانڈ کی ہے جبکہ
لڈ سکھ آرگنائزیشن نے ان کو سیاسی پناہ دلانے اور بھارتی حکومت کی دسترس سے
نوظ کرنے کے لئے امریکہ کی اعلیٰ عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔

رنجیت سنگھ رانا اور سکھمندر سنگھ سندھو نیویارک جیل میں نظربند ہیں۔ یہ دونوں
وان بھارتی پنجاب کے کھاتے پیتے اور ممتاز معاشرتی مقام کے حامل گھرانوں سے
ق رکھتے ہیں۔ بھارتی پولیس نے انہیں مشتبہ جان کر پہلے گرفتار کیا اور مشرقی
ب کے مختلف عقوبت خانوں میں ان کے ساتھ ہر بے جا تشدد روا رکھا۔ جس کے
انہیں بے گناہ جان کر چھوڑ دیا بعد میں دونوں کو ایک ایس ایس پی کے قتل کی
ش میں ملوث کرکے گرفتار کرنا چاہا۔

دونوں اپنی جان بچانے کے لئے امریکہ بھاگ آئے جہاں انہیں گرفتار کر لیا گیا

امریکہ آنے کے بعد ان کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ بھارت حکومت نے ان پر او
بھی بہت سے جرائم کی ذمہ داری عائد کر دی ہے اور وہ بقول بھارت سرکار بھارتی جرنیل
ودیا کے قتل میں بھی ملوث ہیں۔ اب بھارتی حکومت نے انہیں مقدمات چلانے کے لئے
امریکی حکومت سے طلب کیا ہے جب کہ دونوں نے اس کے برعکس امریکی حکومت سے
اپنی جان کے تحفظ کے لئے "ریفیوجی حیثیت" کا مطالبہ کر رکھا ہے۔

اب صورتحال یہ ہے کہ بھارت سرکار نے سرکاری طور پر چونکہ دونوں کو بہت
بڑے دہشت گرد قرار دے رکھا ہے۔ اس لئے امریکی حکومت ان کی قسمت کا کوئی
فیصلہ ہونے تک انہیں کڑی نگرانی میں رکھنے پر مجبور ہے اور دونوں نوجوان ناکردہ گن
کی پاداش میں جیل کاٹ رہے ہیں ان کا کیس لڑنے کے لئے امریکہ میں سکھوں ک
سب سے بڑی تنظیم ورلڈ سکھ آرگنائزیشن نے نیویارک میں تین چوٹی کے وکلا
خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔

رانا اور سندھو کو بھارتی حکومت کی مہربانی سے کچھ زیادہ ہی شہرت مل گئی ہے جب
ایسے بے شمار کیس لندن، کینیڈا، امریکہ اور جرمنی کی عدالتوں میں پہلے ہی سے چل
رہے ہیں۔ ان نوجوانوں سے ملاقات جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے ب
کہ ان کے خاندان کے لوگ مسلسل ذہنی و جسمانی عذاب میں مبتلا ہیں۔ ان کی سرکا
نوکریاں چھین لی گئی ہیں۔

ان کے والدین اور رشتہ داروں کو بے گھر کر کے مختلف بہانوں سے وقتاً فو
جیلوں اور تفتیشی مراکز میں لے جایا جاتا ہے اور اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ
آل انڈیا سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن اور امرت دھاری سکھ رہے ہ
دونوں کا کیس چونکہ زیر سماعت ہے اس لئے بہت سی باتیں ابھی آن دی ریکارڈ نہ
آسکیں لیکن جلد وہ وقت آئے گا جب دنیا بھارتی حکومت کی اصلیت کا ایک اور بھیان

روپ بھی دیکھ سکے گی۔ 96ء تک ان کے کیس زیر سماعت ہی ہیں۔ انشاء اللہ وقت
آنے پر میں الفا کے حوالے سے ہونے والی گفتگو کو بھی ضرور ریکارڈ پر لاؤں گا۔

شام ڈھلے ہم نیویارک میں دنیا کے معروف ترین ریڈیو سٹی ہال پہنچ گئے۔ جو
50ویں شاہراہ پر واقع ہے ریڈیو سٹی ہال کو دنیا کے سب سے بڑے اور تصاویر سے
مزین تھیٹر کی حیثیت حاصل ہے اس میں 6200 تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے
اور اس کی دیواروں پر دنیا بھر کی مصوری کے شاہکار سجے دکھائی پڑتے ہیں۔
ہال کے اندر جیسے جیسے انسانی نگاہ دیواروں پر دوڑتی ہے انسان مبہوت ہو کر رہ جاتا
ہے اس ہال میں دنیا کا مشہور و معروف ڈانسنگ شو "دی راکٹس" ہوتا ہے یہ شو دیکھنے
کے لئے دنیا بھر سے آرٹ اور موسیقی کے شائقین نیویارک آتے ہیں۔
یوں تو نیویارک کی بیشتر عمارتیں دنیا میں اپنی ثانی نہیں رکھتیں اور ایسی تمام
عمارتوں کا تذکرہ بھی شاید ممکن نہ ہو لیکن ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ، روک فیلر سنٹر پلازہ
کے سامنے 18 فٹ بلند پیتل کا مجسمہ جس پر سونے کا پانی چڑھا ہے آزادی کا مجسمہ یو این
کے دفاتر 57ویں شاہراہ کے ڈیپارٹمنٹل سٹورز دریائے ہڈسن کے کنارے سے فلک
س عمارتوں کے مناظر ٹائم سکوئر کی مشہور 42ویں شاہراہ، راک فیلر سنٹر چینل
رڈن، سنٹرل پارک اور اس میں موجود جھیل اور سڑک کنارے بھاگتی بھگیاں سنٹرل
ک کے نزدیک دنیا کے مہنگے ترین ہوٹل، ٹرینٹی چرچ، سینٹ پیٹرک کیتھڈرل جارج
شنگٹن برج کوئینز برج اور بروک لین اور شاٹن کو ملانے والا دنیا کا طویل ترین پل
لیر سٹیڈیم، نیویارک کے دونوں ائرپورٹ میونسپل میوزیم، اس کے ساتھ ساتھ ٹائم
ئر پھر چائنا ٹاؤن اور درجنوں ایسی ہی عمارتیں بلاشبہ دنیا کا عجوبہ مانی جاتی ہیں۔ اور ان
ے کوئی بھی ایسی عمارت پارک، سٹیڈیم یا میوزیم نہیں جہاں ایک مرتبہ جانے کے

بعد آپ کم از کم آدھا دن یہاں نہ گزار دیں۔
وقت کی قلت نے مجھے بھی ان مقامات کا تفصیلی جائزہ لینے کی مہلت کبھی نہیں دی

نیویارک میں یوں تو بہت سے چونکا دینے والے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن یہاں کے آوارہ اور بگڑے ہوئے لٹیروں کے بعد دوسری اہم شے یہاں کے فقیر ہیں امریکہ میں بھیک مانگنا اب کوئی ایسی معیوب بات نہیں جس کا نظارہ میں نے مختلف شہروں میں کیا ہے نیویارک، واشنگٹن، پنسلوینیا، کیلیفورنیا، نواڈا، سان فرانسس کو لاس اینجلز، فلوریڈا غرض جہاں بھی بڑے یا قابل ذکر شہر ہیں آپ کو جانے کا اتفاق ہو گا وہاں مصروف شاہراہوں عوامی آمدورفت کے راستوں تفریح گاہوں وغیرہ کے کسی نہ کسی کونے میں کوئی نہ کوئی ماڈرن بھکاری آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے گا۔
ان کے مانگنے کا انداز بھی ایسا دلچسپ اور متوجہ کرنے والا ہے کہ آپ رکے بغیر آگے نہیں جائیں گے۔
ہمارے ہاں کے فقیروں کی طرح امریکی فقیر آپ کی جان کو نہیں آجاتے بلکہ ان کا مانگنا بھی بے نیازی کا انداز لئے ہوئے ہے۔ زبانی بھیک مانگنے والے زیادہ تر نیویارک ہی میں ملتے ہیں۔ جو ٹریفک سگنل پر آپ کی گاڑی کے رکتے ہی آپ کو پہچان کر ڈبہ بجاتے آپ کے نزدیک آجائیں گے اگر ان کے خیال میں آپ مسلمان ہیں تو مانگنے والا خود کو ستم رسیدہ مسلمان کے روپ میں پیش کر کے اپنا کشکول سامنے کر دے گا بصورت دیگر عام ڈائیلاگ ہی چلیں گے۔
دوسری اور زائد قسم ان فقیروں کی ہے جن کے مطالبات ان کے سامنے لکھے رکھے ہیں۔ یا پھر انہوں نے بڑے بڑے کتبے لکھ کر اپنے گلے کا ہار بنا رکھے ہیں۔ جن پر بھیک مانگنے کی وجوہات درج ہوتی ہیں۔ ان میں بعض وجوہات تو خاصی جارحانہ ہیں مثلاً

ایک صاحب اس لئے بھیک مانگنا چاہتے ہیں کہ ان کے پاس کرے کا کرایہ نہیں ہے ہٹے کٹے ہیں چاہیں تو مزدوری کر کے کما لیں لیکن بھیک مانگنا بہتر خیال کرتے ہیں۔
سگریٹ نوشی کرتی ہوئی ایک نوجوان فقیرنی بیئر کے خالی ڈبے کا کاسہ گدائی بنا کر سامنے رکھے بیٹھی ہے جس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں۔
کوئی گیس کا بل ادا نہیں کر سکتا۔ تو کسی کا بڑا کنبہ ہونے کے سبب تھوڑے ویلفیئر میں گزارا ممکن نہیں۔
آپ اگر انہیں بھیک دیتے ہیں تو ان پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ ایسے بے نیاز ہیں کہ بھیک وصول کرنے کے بعد شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے۔
بھیک مانگنے کے ایسے ایسے طریقے آپ کو دکھائی دیتے ہیں کہ پاکستانی فقیر تو ان کے سامنے دم بھرتے دکھائی دیں گے۔
میں فلاڈلفیا سے سیکرامنٹو جا رہا تھا اور لاس اینجلس سے فلائیٹ تبدیل کرنی تھی ٹرانزٹ لاؤنج میں بیٹھا اگلی فلائیٹ کا منتظر تھا کہ ایک نوعمر نیگرو ڈبہ بجاتا وہاں آگیا۔ منہ سے کمبخت کبھی کچھ نہیں کہیں گے۔
اس نے ایک ٹوپی اوڑھ رکھی تھی جس پر لکھا تھا منشیات سے جنگ۔ میں نے بھی حاتم کی قبر پالات ماری اور ایک (امریکی چونی) اس کے ڈبے میں ڈال کر اپنی انا کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ ہم امریکہ سے بھیک نہیں مانگتے۔ امریکہ کو بھیک دیتے بھی ہیں۔
اس طرح ایک مرتبہ سان فرانسسکو کے بے ایریا میں جب میں نے ایک خوبرو فقیرنی کی تصویر اتاری تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"ڈالر فسٹ"۔۔۔
اس زہرہ گداز نے کہ جس کی جوانی مختصر سی چولی سے پھوٹ پھوٹ پڑتی تھی مجھے کہا۔
"او۔ کے"

میں نے سوچا سودا مہنگا نہیں اور پھر اس ہاتھ سے دے اور اسی ہاتھ لے کے اصول کے تحت میں نے ڈالر دیا اور اس نے تصویر اتروالی۔

ایک روز اسی طرح فلاڈلفیا میں مسز قریشی کے گھر جب دستک کی آواز پر میں نے دروازے کے سوراخ سے باہر جھانکا ایک گوری میم کو منتظر پایا۔

تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر میں نے دروازہ کھول دیا حالانکہ میرے میزبانوں نے اس کی ممانعت کر رکھی تھی کہ یہاں کچھ بھی ممکن تھا۔

"فرمائیے"---

میں نے اس کی شخصیت سے قدرے متاثر ہو کر پوچھا۔

"مجھے ایک ڈالر چاہئے"

اس نے مجھے چونکا دیا۔

"کیوں"!

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"میرے پاس سگریٹ ختم ہو گئے ہیں"

اس کی بے نیازی برقرار تھی۔

"لیکن اس سے میرا کیا تعلق"

میں نے چاہا سلسلہ گفتگو آگے بڑھے لیکن مسز قریشی کو خبر ہو گئی اور انہوں اسے ایک ڈالر دے کر رخصت کر دیا۔

"خدا کا شکر کرو---تم امریکہ میں بھیک مانگ رہی ہو"

میں نے جاتے جاتے کہا۔

اور---

وہ مسکرا دی۔

شاید اسے میری بات کی سمجھ نہیں آئی تھی---یا پھر اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

امریکہ پچاس ریاستوں کے مجموعے کا نام ہے اور بلاشبہ ہر ریاست نے اپنے اندر ایک جہان آباد کر رکھا ہے لیکن کیلیفورنیا کی بات ہی کچھ اور ہے۔

امریکن کیلیفورنیا کو "گولڈن سٹیٹ" Golden State کہتے ہیں اور کوئی بھی غیر ملکی جب کیلیفورنیا کے شہروں میں گھومتا ہے تو اسے امریکنوں کی اس بات کا یقین بھی کرنا پڑتا ہے۔

کیلیفورنیا کو 12 کاؤنٹیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور سب سے پہلی اورنج کاؤنٹی Orannge ہے۔

یہ کاؤنٹی اپنے خوبصورت قریباً 42 میل پر مشتمل سمندری ساحل اور اس پر بھرے پھلوں کے طویل و عریض باغات کی وجہ سے ہمیشہ سیاحوں کا مرکز نگاہ بنی رہی ہے۔

رسیلے (سٹرس) پھلوں کے طویل باغات کی وجہ سے ہی اس کا نام "اورنج کاؤنٹی" رکھا گیا ہے۔

لاس اینجلس اور سان ڈیاگو کے درمیانی علاقے پر مشتمل اورنج کاؤنٹی پیسفک کے سمندری ساحل سے "سٹیارنیا" کے پہاڑی سلسلوں تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یہاں سالانہ 15 انچ بارش ہوتی ہے اور عموماً درجہ حرارت 70 ڈگری رہتا ہے۔ اس کاؤنٹی سے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ یہاں سورج کی حکمرانی سارا سال قائم رہتی ہے۔ جو

امریکنوں کے نزدیک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

"سنٹیارنیا" کے پہاڑی سلسلوں سے آنے والی گرم ہوائیں ان کے مشام جان
معطر اور گرم رکھتی ہیں۔

سپین سے آنے والے مشنریوں نے سب سے پہلے اس علاقے کو 16 ویں صدی
کے اوائل میں آباد کیا تھا بعد میں 17 ویں صدی میں یہ علاقہ سپین کی عملداری میں
آ گیا۔ اورنج کاؤنٹی کا علاقہ امریکہ کا 15 واں بڑا میٹروپولیٹن آبادی والا علاقہ شمار ہو
ہے اور دنیا کی 13 بڑی معیشتوں میں سے ایک معیشت سمجھا جاتا ہے اس کاؤنٹی میں
26 شہر اور 20 لاکھ سے زائد لوگ آباد ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق سال میں 3 کروڑ سے زیادہ سیاح اس کاؤنٹی کے
قدرتی اور انسانی ہاتھوں سے تراشیدہ خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کے
یہاں آتے ہیں۔

حسن تعمیر کے حیرت انگیز مظاہر، بڑے بڑے شاپنگ پلازہ، ہوٹل، شراب خا
اور کلب اس خطے کا طرہ امتیاز ہے۔

ساحل سمندر پر سیاحوں کے قیام اور لطف اندوز ہونے کے لئے خوبصورت ہ
بنائے گئے ہیں۔ جہاں باد صبح جب علی الصباح رات کی بدمستیوں سے مدہوش سا
سمندر کے مکینوں کو بیدار کرتی ہے تو اس میں موسیقی کا ایک عجب تاثر پایا جاتا ہے۔

جی ہاں!

شاید یہ بات آپ کے لئے حیران کن ہو کہ اس ساحلی علاقے میں علی الصبا
ہوائیں چلتی ہیں ان میں ساحلی ریت سے ٹکرانے کے بعد جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ ا
شاندار اور نیچرل موسیقی بسا اوقات انسان کو مدہوش کر کے رکھ دیتی ہے بالکل ا
ہی جیسے کبھی کبھی درختوں کے طویل سلسلے میں چلنے والی تیز ہوائیں پتوں سے ٹکر

ہیں تو ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں سیاحوں کو سہولیات مہیا کرنے کے لئے جو یورپین سٹائل کے ہوٹل قائم
ہیں ان کے کمروں کی تعداد 38 ہزار ہے اور 38 ہزار کمروں میں دنیا بھر کی آسائش اور
عیاشی موجود ہے۔

قریباً 5 ہزار ایسے ریسٹورنٹ ہیں جہاں کام و دہن کی تمام لذتیں خواہ ان کا تعلق
دنیا کے کسی بھی کونے یا تہذیب سے ہو موجود ہیں۔

اس کاؤنٹی کو امریکہ کا "Vacation Land" بھی کہا جاتا ہے جس کی بڑی وجہ
یہاں کا ڈزنی لینڈ ہے۔

○

1955ء میں والٹ ڈزنی نے مالٹوں کے باغات اور کھیتوں کے طویل سلسلوں
کے عین درمیان لاس اینجلس سے خاصے فاصلے پر "ڈزنی لینڈ" قائم کیا تھا۔

ان دنوں ڈزنی لینڈ ناٹ بیری فارم کی چند بلڈنگوں اور سیزناٹ کے فرائیڈ چکن
کے ایک ریسٹورنٹ پر مشتمل تھا۔ یہاں بچوں کی تفنن طبع کے لئے ایک "بھوتوں کا
ٹاؤن" بنایا گیا تھا۔ جہاں بچوں کو مختلف ماسک پہنا کر بھوت کا روپ اختیار کرنے میں بڑا
مزہ آتا تھا اس ٹاؤن میں ہر طرف بھوت ہی بھوت دکھائی دیتے تھے۔

آج ڈزنی لینڈ بلاشبہ دنیا کا آٹھواں مجموعہ بن چکا ہے --- جہاں تفریح ایڈونچر اور
سیر و سیاحت کے لئے وہ سب کچھ موجود ہے جو انسانی تصور میں آ سکے۔ خوابوں کی اس
دنیا میں سارے خواب زندہ ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور دنیا بھر کے بچوں کے لئے واقعی
یہ "خوابستان" ہے۔

اورنج کاؤنٹی میں خوابوں کی اس سرزمین پر کچھ اور تعمیرات مثلاً مووی لینڈ ویکس
میوزیم، اور میڈائیول ٹائمز (Medieval) یہ سب عمارتیں بیوناپارک میں واقع ہیں۔

ایروائن Irvine میں کروڑوں ڈالر سے تیار کردہ وائلڈ ریور کمپلیکس جہاں دریائی جانوروں کے کرتب و کمالات دکھائے جاتے ہیں۔

بیٹارنیا میں مووی لینڈ آف دی ائر میوزیم کا چلڈرن میوزیم جہاں فلموں میں استعمال ہونے والے نئے پرانے جہاز رکھے گئے ہیں۔ لاہیرا کا چلڈرن میوزیم اور باربی سٹی اور گڑیوں اور کھلونوں کا مرکز جہاں کی منی ایچر ٹرین اور دنیا کے قدیم ترین کھلونے اور گڑیاں جن کا شمار اب نوادرات میں ہوتا ہے رکھے گئے ہیں۔

مجھے بھی ڈزنی لینڈ کی ایک جھلک دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ڈزنی لینڈ کا یہ سفر میں نے اپنے بہت پیارے دوست ڈاکٹر سیکھوں کی فیملی کے ساتھ کیا تھا۔ کسی عام آدمی کے لئے جو امریکہ میں رہتا ہوا اپنے مہمان کے لئے چند گھنٹے نکال لینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالنا۔

اور----

ایک معروف اور مشہور سرجن کے لئے تو یہ بات ناممکن سمجھی جاتی ہے کیونکہ جیسے میں وہ کار ڈرائیو کرنے بیٹھتا ہے۔ اس کی پتلون کی بیلٹ سے بندھا "بیپر" بجنے لگتا ہے جو اس بات کا سگنل ہے کہ فون آ گیا ہے۔

یہ فون عموماً مریضوں کا ہوتا ہے یا پھر کسی مریض سے متعلق کوئی اطلاع----

امریکہ میں مسیحاؤں کے لئے صرف مسیحا بن کر جینا اتنا ناممکن ہے جتنا پاکستان میں کسی ایماندار صحافی کے لئے "صرف صحافی" بن کر جینا---

ان حالات میں اگر کوئی ڈاکٹر اپنے مہمان کے لئے 24 گھنٹے نکال لے تو اس سے زیادہ بہتر مہمان نوازی کی مثال شاید تاریخ کے اوراق میں بھی نہ مل سکے---

تین گھنٹے کی طوفانی ڈرائیونگ کے بعد ہم ڈزنی لینڈ کے پارکنگ ایریا میں پہنچ گئے۔

یہ پارکنگ ایریا کیا تھا---

کاروں کا سمندر تھا----

تاحد نگاہ کاریں ہی کاریں----

اگر میں یہ کہہ دوں کہ وہاں شاید آٹھ دس ہزار کاریں موجود تھیں تو پریشان نہ ہو جائیے گا ہزار سے کم تو ہرگز نہیں ہوں گی۔

ذرا تصور کیجئے کہ دس بیس ہزار کاریں ہیں تو آنے والے کتنے ہوں گے؟ اور ایک لمحے کے لئے سوچئے کہ اگر لاہور یا پاکستان کے کسی اور شہر میں کسی جگہ دو سو کاریں بھی اکٹھی ہو جائیں تو کیا طوفان بدتمیزی برپا ہو جائے گا۔

شاید لاہور کے باسیوں کو 90ء کا وہ مسلم لیگ کا جلسہ یاد ہو جو لاہور کے اقبال پارک میں منعقد ہوا تھا اور جس کے بعد 48 گھنٹے تک لاہور کا راستہ بذریعہ سڑک سارے پاکستان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔

صورت حال اتنی اذیت ناک ہو گئی تھی کہ خدا کی پناہ--- مضافات سے گوالے دودھ لاہور نہیں پہنچا سکتے تھے۔

مال روڈ پر پندرہ آدمیوں کا جلوس نکل آئے تو لاہور کی سب بڑی شاہراہ پر میدان حشر برپا ہو جاتا ہے--- مال روڈ اور اس سے ملحقہ سڑکوں پر وہ قہر مچتا ہے کہ الامان الحفیظ!

نہ کوئی ڈھنگ سے آسکتا ہے نہ جا سکتا ہے---- ٹریفک جام--- اور ٹریفک پولیس کے اہلکاروں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں----

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زندگی کے بہترین اصول اور سبق کو جو ہمارے قائد نے ہمیں بتایا اور جس نعرے کے ساتھ ہمارے قائداعظم نے پاکستان کے قیام کی منزل کی طرف قدم بڑھایا بھول گئے----

میرا مطلب ڈسپلن سے ہے--- تنظیم سے ہے----!!

امریکن کوئی آسمانی مخلوق نہیں----!

اخلاقیات میں ہم کتنے بھی برے سہی امریکنوں سے زیادہ برے نہیں---!!

کہنے کی باتیں اور ہیں اور عملاً امریکہ بھی جرائم کا گڑھ ہے----

وہاں بھی آسمانی آفتیں آئے دن نازل ہوتی ہیں۔ زندگی کے وہ تمام ہنگا۔
ہمارے ہاں وقوع پذیر ہوتے ہیں وہاں بھی ہوتے ہیں۔

لیکن----

فرق صرف ایک ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کو تنظیم سے گزارنے کا سلیقہ سی
ہے۔ وہ ڈسپلن کے پابند ہوگئے ہیں اور ہم نے اس لفظ کو "شجر ممنوعہ" سمجھ کر
زندگی کی ڈکشنری سے نکال کر پھینک دیا ہے۔

امریکہ کی جس سڑک پر نظر دوڑائیے ٹریفک کا سیلاب رواں دواں نظر آئے

لیکن---

ایک تنظیم کے ساتھ سلیقہ مندی سے۔

اور یہی ہے ان کی کامیابی اور ہماری بدبختی کا راز کہ ان لوگوں نے ڈسپلن کو
اور ہم نے دھتکار دیا۔

○

ڈزنی لینڈ کے اس طویل و عریض پارکنگ لاٹ کو مختلف حصوں میں تقسیم
ہے ہر حصے کے سامنے اس کا مخصوص نمبر موجود ہے اور رنگوں کی شناخت اس۔
ہے-- جہاں گاڑی پارک کرتے ہیں وہاں سے آپ کو جو پارکنگ ٹکٹ ملتا ہے ا
بھی آپ کے پارکنگ لاٹ کا مخصوص نمبر درج ہے تاکہ آپ کو کسی پریشانی کا س
کرنا پڑے۔

افسوس ہم نے مغرب کی ہر بری عادت اور روایت اپنائی اور ہر اچھی عاد

وایت سے منہ پھیر لیا۔

پاکستان کی کسی معروف شاہراہ پر کسی شاپنگ سنٹر، کسی پارک، تفریح گاہ یا عوامی
جتماع کی اور کسی جگہ پر آپ کو کبھی ڈھنگ کا ٹوائلٹ نہیں ملے گا---

اول تو موجود ہی نہیں ہوگا اور لوگ مجبوراً اور عادتاً عمارت کو گندا کریں گے اگر ہے تو
س کا حلیہ اتنا بگڑ چکا ہوگا کہ آپ یہاں سے گھر جا کر ہی کچھ کرنا بہتر خیال کریں گے۔

خدا جانے کہ تمام وسائل ہونے کے باوجود ہم آخر صفائی ہی کو برقرار کیوں نہیں
کھنا چاہتے جو ہمارے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق ہمارے ایمان کا نصف
نصہ ہے۔

یورپی ممالک اور امریکہ میں جا کر اپنی اس ملی بدبختی پر رونا آتا ہے۔

ڈزنی لینڈ میں داخلے کے ٹکٹ پر "پاسپورٹ ٹو ڈزنی لینڈ" لکھا ہوتا ہے---جس
کے درمیان میں مشہور عالم ڈزنی لینڈ کی تصویر اور اس کے گرد دائرے میں والٹ ڈزنیز
یجک کنگڈم کلب درج ہے---!

امریکی معاشرہ حالانکہ قطعی مادیت پرست معاشرہ ہے۔

لیکن----

ایک بات کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ امریکی زندگی کے ہر لمحے سے اپنے حصے کی
وشیاں ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ "بائی ہک یا بائی کروک۔"

معمولی خوشی پر وہ اچھل کود کریں گے کہ ہم ایسے بے حس اور ڈیپریشن کے شکار
گ محو حیرت ہو کر رہ جائیں----!

یہیں دیکھ لیجئے----!

جیسے ہی ڈاکٹر سیکھوں کے بچوں کے ہاتھوں میں ٹکٹ آئے اور وہ اس طویل قطار میں
لگے جس میں پہلے سے سینکڑوں ذائر موجود تھے انہوں نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔

اس قطار میں موجود شاید ہی کوئی چہرہ "سیریس" ہوگا۔
خوشی ان کے چہروں سے پھوٹ پھوٹ پڑتی تھی --- یہ سب لوگ اگر
بھی ہوں تو بھی خوش نظر آنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے ----

ہنس رہے تھے ----

قہقہے لگا رہے تھے ---

عجیب عجیب جسمانی حرکات سے اپنی ایکسائٹمنٹ کا اظہار کر رہے تے
خواتین تو اپنی خوشیوں میں زبردستی دوسروں کو شامل کر رہی تھیں --- اب
یہ نہ پوچھئے کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟

شاید آپ کو سن کر خوشی نہیں ہوگی۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر سیکھوں کی بچی پنکی نے
پکڑا اور مجھے قریباً کھینچتی ہوئی Enchanted Tiki Room تک لے گئی

اس ٹکی روم کے کمالات آپ کو کیا سناؤں اور کیسے سناؤں بس یوں
ظالموں نے قدم قدم پر دل موہ لینے کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔

آپ اس "ٹکی روم" کو ایک چھوٹا سا باغ سمجھ لیجئے جہاں رات کے اندھیر
آپ داخل ہوتے ہیں اور آپ پر سویرا طلوع ہونے والا ہے ----

صبح طلوع ہونے کا یہ منظر بڑا دل خوش کن ہے ----

جیسے جیسے سورج اندھیرے کی چادر سے جھانکتا ہے --- اس کی روشن
بدلتی اور ظلمت کی سیاہ چادر کو چاک کرتی باغ پر اترتی ہیں۔ درختوں کا سویا ح
لگتا ہے ----

ظلمت کے لمحہ بہ لمحہ اجالے کی طرف سفر کرنے کے ساتھ ساتھ ان
اور پودوں پر زندگی انگڑائیاں لینے لگتی ہے ----!

کرن کرن اجالا اترتا ہے تو پرندوں کی مختلف النوع آوازیں ماحول کو سحر زدہ
ا کرنے لگتی ہیں۔

یوں لگتا ہے جیسے پرندے باتوں باتوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ
صبح ہو گئی؟ مختلف پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول میں موسیقی کا ایسا تاثر بنا دیتی ہے کہ پھر
دیکھنے والا اس میں ڈوبتا چلا جائے۔

اس گفتگو میں ہر چرند پرند کے ساتھ ساتھ درختوں کی شاخیں، درخت اور باغ
میں موجود ہر شے حصہ لیتی ہے اور پتے پتے کی الگ الگ آواز کو اس طرح موسیقی میں
سمویا گیا ہے کہ ایک سماں بندھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہے اس شو کی روداد جو ہم نے اس "ٹکی روم" میں دیکھا تھا۔

ننھی پنکی نے مجھے جیسے سارا ڈزنی لینڈ ایک ہی مرتبہ دکھا دینے کا مصمم ارادہ باندھ
لیا تھا۔

دوپہر گئے تک ہم نے کاؤنٹ بیر جمبوری، جنگل کروز، ہانٹڈ منشن اور پائر سیٹس آف دی
کریبئن کو جیسے تیسے دیکھ لیا ---

یہ سب کیا ہے ---

ٹیکنالوجی اور سائنس کا کمال ہے۔

ہائی ٹیکنالوجی کے ذریعے انسانی فطرت کو سمجھتے ہوئے اس کو ہر ممکن طریقے سے
بھلے کچھ دیر ہی کے لئے سہی غم دنیا سے بے نیاز ہو کر "انجوائے" کرنے کے مواقع بہم
پہنچائے گئے ہیں۔

ڈزنی لینڈ خوابوں کا جزیرہ ہے ---

لیکن ----

یہاں بچے ہی نہیں بڑے بھی خواب دیکھتے ہیں----!!

خوابوں کی تعبیر دیکھتے ہیں----

خواب یہاں زندہ ہو جاتے ہیں----

زندہ خوابوں کے سنگ میں نے بھی شام ڈھلنے کا وقت یہاں گزارا۔ اس درمیاں ہم نے ڈزنی لینڈ مونوریل کی سیر کی بگ تھنڈر ریل روڈ دیکھا، ایلس ان ونڈر لینڈ، سب میرین وائیج کا نظارہ کیا۔

رولر کوسٹر پر بیٹھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی----!!

حیرت ہوتی ہے کہ امریکن زندگی میں "چیلنج" کے لئے کیا کیا کر گزرتے ہیں۔

ایسی ایسی خطرناک "رائیڈز" لیتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔

عام آدمی تو ان رائیڈز کو دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔

لیکن----

یہ کم بخت امریکی----ایڈونچر ہی کے لئے سہی۔ ان خطرناک "رائیڈز" پر سوا ضرور ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کے پھر چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھالیں گے۔ ایک خطرناک چیخیں بلند ہوتی ہیں کہ سننے والے کا کلیجہ منہ کو آنے لگے۔

لیکن امریکن اسے "انجوائے" کرنا کہتے ہیں----

اور "انجوائے" اور "چیلنج" کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

رات ایک پہر بیت گئی تھی جب ہم گھر واپس پہنچے۔

امریکہ میں شاید ہی کوئی رات بارہ ایک بجے سے پہلے سوتا ہوگا۔

کیلے فورنیا کی دوسری اہم کاؤنٹی کا نام "سان ڈیاگو کاؤنٹی" ہے۔

اپنی خوبصورت جھیلوں اور شاندار موسموں والی یہ کاؤنٹی "کیلے فورنیا" کی روایتی ندگی اور رہن سہن کا شاندار عکس پیش کرتی ہے۔ جنگلات سے لدی پھدی پہاڑیاں، ناریخی عمارات، جاذب نظر شاپنگ مال، طویل و عریض زرعی فارم، گولف کے یدان مشہور زمانہ چڑیا گھر اور مشہور عالم ٹیلی سکوپ بے شمار دلچسپیوں میں سے وہ چند لچسپیاں ہیں جن کی طرف کیلے فورنیا میں آنے والے سیاح کھنچے چلے آتے ہیں۔

سمندر اور پہاڑی سلسلے کے درمیان موجود سان ڈیاگو کا شہر اپنے آپ میں ایک ے کی چیز ہے۔ اس کا جغرافیہ ایسا ہے کہ یہاں میلوں لمبا ایک قدرتی ساحل بھی دبخود سے بنتا چلا گیا ہے۔

سان ڈیاگو کیلے فورنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ پہلا شہر لاس اینجلس ہے۔ سان ڈیاگو کو ست ہائے متحدہ امریکہ کا ساتواں بڑا شہر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

واٹر سپورٹس کی جنت اس شہر میں خصوصی تیار کردہ واٹر فرنٹ ایریا، کوروناڈو، ر آئس لینڈ، ہاربر آئس لینڈ اور مشن بے ایریا پانی کے مختلف کھیلوں کے شوقین ڑیوں کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے اور ایڈونچر پسند امریکی اپنی چھٹیاں رنے کے لئے ادھر کا رخ کرتے ہیں۔

سان ڈیاگو کی 17 میل لمبی بندر گاہ نیوی کا جہازوں کا اڈہ بھی ہے۔ اس علاقے میں

لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں، چھوٹے سمندری جہازوں
سمندری ساحلوں کا نظارہ کرتے ہیں۔

سان ڈیاگو کے 70 میل لمبے سمندری ساحل پر جگہ جگہ خوبصورت جھیلیں تر
گئی ہیں سان ڈیاگو کو امریکہ کا "سپورٹس ٹاؤن" بھی کہا جاتا ہے۔ خصوصاً گولف، ٹینس
سائیکلنگ، مچھلی کا شکار، پانی کی سطح کے کھیل اور ہائیکنگ کا سلسلہ یہاں سارا سال ز
شور سے جاری رہتا ہے۔

سان ڈیاگو کے میدان اپنے قدرتی حسن اور سبزے کی وجہ سے شاید امریکہ
بہترین میدانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

اسی طرح یہاں کے ساحل جہاں خصوصاً لوگ مچھلی کا شکار کرتے ہیں قد
ہاتھوں کی صناعی کا بہترین شاہکار تو ہیں ہی--- خود امریکیوں نے بھی اپنی زمین
حسن کو چاند لگا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

سان ڈیاگو کیلیے فورنیا کا دوسرا بڑا شہر ہی نہیں بلکہ مغربی ساحل پر امریکہ کی
فوج اور ہوائی فوج کا بھی سب سے بڑا مرکز ہے۔ اقتصادی لحاظ سے دوسرے نم
سان ڈیاگو کھیتی باڑی کے علاقہ میں چوتھے نمبر پر سمجھا جاتا ہے۔

یہ شہر شمال جنوب اور مشرق کی طرف 20 میل سے بھی زیادہ رقبے میں پھیلا
ہے اور مختلف قوموں کے لوگ یہاں پر رہتے ہیں۔

کسی زمانہ میں مشن بے نام سے مشہور جو حصہ بالکل فضول سمجھا جاتا تھا
4600 ایکڑ کا ایک دلکش پارک بن گیا ہے۔ مشن بے کے جنوب مشرق میں واقع
پرانے شہر میں خوشحال سپینش میکسین وراثت آج بھی محفوظ ہے اس کے ساتھ ہ
میں آرٹ واٹر ٹرانسپورٹ اور کمرشل شپنگ کے کئی اہم مراکز ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں سان ڈیاگو کے بارے میں کچھ عرض کروں اس کی آب

ہناوہ، اخبارات اور ٹی وی وغیرہ کے بارے میں کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

سان ڈیاگو کی آب و ہوا کو امریکہ کے لئے سب سے زیادہ مناسب سمجھا جاتا ہے۔
سطاً یومیہ درجہ حرارت 70 ڈگری رہتا ہے جب کہ سالانہ اوسط بارش صرف 9
شاریہ 5 انچ ہوتی ہے۔ زیادہ تر بارش دسمبر، جنوری اور فروری میں ہوتی ہے۔
ردی عام طور پر ہلکی ہوتی ہے، گرمیاں شہر میں کافی سہانی ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ
ی اگست اور ستمبر میں پڑتی ہے۔

اس آب و ہوا کی وجہ سے سان ڈیاگو کے لوگ تمام طرح کے کپڑے پہنتے ہیں۔
رتیں اکثر تمام سال سوتی کپڑے پہنتی ہیں۔ سردیوں میں ہلکے گرم کپڑے اور رین
ٹ بھی استعمال کرتے ہیں مرد اکثر ہلکے رنگوں والے سوٹ پہنتے ہیں۔ سوٹ کے
تھ ٹائی کا استعمال عام ہو جاتا ہے باہر سے آنے والے لوگوں کے لئے سردیوں میں
شام سویٹر یا ہلکی جاکٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔

سان ڈیاگو کے ہر لحاظ سے خوشگوار آب و ہوا سیدھے سادے ڈھنگ کی زندگی اور
ری پرکشش سہولیات کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ اس شہر کو دیکھنے کے لئے آنے والے
سے لوگ بالآخر اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہیں آباد ہو کر کوئی نہ کوئی کام دھندہ
شروع کر دیتے ہیں۔

سان ڈیاگو سے یوں تو چھوٹے موٹے کئی اخبارات شائع ہوتے ہیں مگر یہاں کے
خبار سان ڈیاگو یونین اور سان ڈیاگو ایوننگ ٹریبون ہی اہم ہیں۔ لاس اینجلس ٹائمز
وزانہ سان ڈیاگو ایڈیشن چھاپتا ہے۔ اس کے علاوہ سینٹر سٹی نیوز، نیوی ڈیپچ ٹائٹ
ریویو۔ ڈیلی ٹرانسکرپٹ اور سپورٹس ڈائجسٹ بھی سان ڈیاگو کے قابل ذکر
ت میں شامل ہیں۔ اتنا ہی نہیں کئی بدیشی زبانوں اور فرقوں کے اخبارات بھی
عام ملتے ہیں۔

اے ایم اور ایف ریڈیو پر بڑے نیٹ ورک اور آزاد سٹیشن دونوں ہی کام کرتے ہیں اور ٹی وی پروگرام بھی کم از کم چار چینلوں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پروگرام ہمارے ہی ملک کی طرح وہاں بھی اخبارات میں باقاعدہ چھاپے جاتے ہیں۔

○

شراب سان ڈیاگو میں عام ہوتی ہے اور صبح 6 بجے سے دوپہر 2 بجے تک شراب خریدی جاسکتی ہے۔

شراب کی فروخت شراب کے سٹوروں اور گروسری سٹوروں پر ہوتی ہے۔ جب کہ پینے کے لئے شراب ریسٹورنٹوں، باروں، پبوں، نائٹ کلبوں اور دوسرے لائسنس شدہ مقامات پر ہوتی ہے۔ 21 برس سے کم عمر کا کوئی بھی شخص نہ تو شراب خرید سکتا ہے اور نہ ہی ریسٹورنٹوں، باروں، پبوں اور نائٹ کلبوں وغیرہ میں جا کر پی ہی سکتا ہے۔ کسی بھی شراب خریدنے والے یا پینے والے شخص کے لئے مانگے جانے پر عمر کا ثبوت دینا ضروری ہے۔

یوں تو سان ڈیاگو میں تعلیمی اداروں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے مگر اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں سان ڈیاگو سٹیٹ یونیورسٹی اینڈ دی یونیورسٹی آف کیلی فورنیا اور سان ڈیاگو کیمپس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں ہی ادارے ''سٹیٹ سسٹم'' کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ لازولا کا انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی بھی ایک بین الاقوا(می) اہمیت کا ادارہ ہے۔

○

سان ڈیاگو میں گھومنے پھرنے کے لئے کار ہی سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ زیاد(ہ) بڑے قابل دید مقامات اور شاپنگ مرکزوں تک کار میں آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ شہر کی عام سڑکوں پر کار 35 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائی جا سکتی ہے جب کہ ا

ملی سڑکوں پر جہاں ٹریفک بہت زیادہ نہیں ہوتی کاروں کی رفتار 55 کلومیٹر فی گھنٹہ قرر کی گئی ہے، یہاں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ مقررہ رفتار کی حد اور رفتار یکروں پر کاروں کو آئینہ کیا جانا ضروری ہے۔

باہر سے آنے والے ان لوگوں کے لئے جن کے پاس اپنی کاریں نہیں ہیں کسیوں کا انتظام ہے ٹیکسیوں کو کرائے پر دینے والی کمپنیوں کے نام و پتے اور ٹیلیفون ہر آسانی سے دستیاب ہیں۔ کوئی بھی شخص ٹیلیفون کر کے ٹیکسی منگوا سکتا ہے۔

کسیوں کا کرایہ میٹر کے حساب سے چارج کیا جاتا ہے جو اکثر نارمل ہی ہوتا ہے۔

سان ڈیاگو کے ٹرانسپورٹ سسٹم میں بس سروس کے بعد لائٹ ریل ٹرانزٹ کو م مقام حاصل ہے۔

یہاں آنے والے سیاح اکثر سان ڈیاگو ٹرانزٹ کارپوریشن کی بسوں سے سفر تے ہیں یہ سروس جولا سے کوروناڈو، پوائنٹ لوما، لا میا اور ایل کیپون ہوتی ہوئی سیکو تک جاتی ہے۔ 90ء میں یہاں بسوں کا کرایہ 80 سینٹ ہوا کرتا تھا۔

جہاں تک سان ڈیاگو ریل ٹرانزٹ کا تعلق ہے اس کی ٹرالی سروس سان ڈیاگو سے ن شرروئی بین الاقوامی سرحد تک جاتی ہے۔

ہر پندرہ منٹ کے بعد آپ کو ٹرالی مل جاتی ہے---!!

سان ڈیاگو کے یوں تو ہر پارک کی اپنی انفرادیت ہے لیکن ''پالبور آپارک'' جو 11 ایکڑ رقبے میں پھیلا ہے۔ تفریحی اور کلچرل سرگرمیوں کا مرکز بنا رہتا ہے۔ ں وقتاً فوقتاً مختلف النوع نمائشیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

یہاں فورڈ بلڈنگ میں واقع ایرو سپیس کا تاریخی سنٹر امریکہ کی سمندری فوج میں ڈیاگو کے اہم ترین رول کا شاہد ہے۔

اسی پارک میں واقع کیلے فورنیا بلڈنگ سپین کی دستکاری کا مرکز سمجھا جاتا

ہے۔ بوٹینیکل گارڈن میں رنگ برنگے پھولوں اور پودوں کو دیکھ کر بے اختیار علا
اقبال کا وہ شعر۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیراہن

لبوں پر آجاتا ہے۔

○

اس کے علاوہ یہاں پر ہی ہال آف چمپئین نامی ایک سپورٹس میوزیم ہے۔ جس
سان ڈیاگو کے کھلاڑیوں کے آئل پینٹ فوٹوگراف اور یادگاری نشانوں کا ایک نا
مجموعہ ہے۔

سپورٹس میوزیم کے علاوہ ایک میوزیم آف مین اور ایک نیچرل ہسٹری م
بھی ہے۔ میوزیم آف مین میں انسان کے ارتقاء کی کہانی جس ڈھنگ سے دہرا
ہے۔ وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے، نیچرل ہسٹری میوزیم میں معدنیات او
قدرتی ذرائع کا ذخیرہ ہے۔ اس کے علاوہ اسی پارک میں سان ڈیاگو میوزیم آف
بھی ہے۔ جہاں امریکی، برطانوی اور ایشیائی آرٹ کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس پارک میں اولڈ گلوب تھیٹر بھی تماشائیوں کے لئے بڑی
موجود ہے۔ جسے سان ڈیاگو میں تھیٹر کا گھر کہا جاتا ہے۔ اور ایک ریوبن ایچ فلیٹ
تھیٹر اور سائنس سنٹر ہے جو کہ سب سے بڑا پلینی ٹوریم ہے اور جہاں نایاب
اشیاء اور دیگر قابل دید چیزیں موجود ہیں۔ سان ڈیاگو کا چڑیا گھر دنیا بھر کے س
بڑے چڑیا گھروں میں سے ایک ہے۔ جہاں دنیا کے کئی نایاب قسم کے جانور ہیں
قسم کے 3200 سے بھی زیادہ جانور یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ رینگ
جانور بھی یہاں موجود ہیں۔

چڑیا گھر کے گرد جہاں دور دور تک ہریالی ہی ہریالی ہے وہاں آس پاس کے مناظر
ی تماشائیوں کا من موہ لینے والے ہیں۔ اس چڑیا گھر میں سان ڈیاگو کے دیگر قابل دید
امات کی طرح داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہی ممکن ہے۔ کوئی بھی آدمی اپنے ساتھ کوئی پالتو
نور لے کر نہیں جاسکتا۔

بڑے چڑیا گھر کے راستے میں ہی ڈیڑھ ایکڑ زمین میں بنایا گیا بچوں کا چڑیا گھر آجاتا
ہے۔ جہاں مقابلتاً سیدھے سادے قسم کے جانور رکھے گئے ہیں۔ اس چڑیا گھر میں
انوروں کی ایک نرسری بھی ہے۔ یہاں پر ہی سپینس ویلج آرٹس اینڈ کلچر سنٹر ہے۔
ہاں آرٹس اور دستکاری کے قابل دید اور نایاب نمونے بھی بھاری تعداد میں دیکھے
اسکتے ہیں۔

یہاں سب سے زیادہ قابل ذکر اور قابل دید مقام اولڈ ٹاؤن سان ڈیاگو سٹیٹ
شاریکل پارک ہے۔ یہ جگہ کیلی فورنیا کی پہلی بنیاد کی یاد دلاتی ہے اس میں پرانے سان
یاگو کی اصل عمارتیں شامل ہیں۔ نزدیک ہی واقع پریزیڈیو پارک میں کیلی فورنیا کے پہلے
شن کی جگہ اور فوجی قلعہ ہے۔

اس علاقہ میں اولڈ ٹاؤن پلازہ جسے سان ڈیاگو کی معاشرت کا بڑا مرکز سمجھا جاتا
ہے۔ اور 1851ء میں بنا پینڈلٹن ہاؤس جو طرح طرح کے فرنیچر کا گھر ہے کے ساتھ
ساتھ سان ڈیاگو یونین میوزیم ہے۔ اس کی تعمیر 1988ء میں ہوئی تھی۔ یہاں سے ہی
سان ڈیاگو کے پہلے اخبار کی شرعات ہوئی تھی۔

پرانے ڈیاگو شہر کے علاقہ میں ہی سیلی اصطبل وہیلے ہاؤس۔ سیرا۔ تاریخی میوزیم،
لائبریری اینڈ ٹاور گیلری اور پوائنٹ لوما جیسے قابل دید مقامات بھی ہیں۔ سیلی اصطبل
میں پرانی گھوڑا گاڑیوں کا ذخیرہ ہے۔ وہیلی ہاؤس میں پرانی کچہریاں تھیں جب کہ سورا
تاریخی میوزیم میں سان ڈیاگو کے 1562ء سے اب تک کی تاریخ کا کیپسول محفوظ ہے

یہ جگہ آج بھی اپر کیلی فورنیا میں پادری جونی پریو سیرو کی طرف سے قائم کئے گئے پہ
مشن کی یاد تازہ کرتی ہے۔

جہاں تک پوائنٹ لوما کا تعلق ہے یہ بحرالکاہل اور سان ڈیاگو کی خلیج کو آپس میں ملا
ہے۔ سردیوں میں سمندر کی پوزیشن میں تبدیلی کے بعد یہاں کی خوبصورتی دیکھنے
تعلق رکھتی ہے۔

○

کیلی فورنیا کی تیسری کاؤنٹی ان لینڈ ایمپائر کہلاتی ہے جو پتھریلی لیکن سر
پہاڑیوں صحرا اور پھولوں اور پھلوں سے لدی وادیوں پر مشتمل ہے۔ اس کاؤنٹی
کیلی فورنیا کی تاریخی عمارات اور بے شمار کلچر سنٹر موجود ہیں۔

کیلی فورنیا کے شمال میں واقع اس کاؤنٹی میں بیک وقت آپ کو برف اور پا
پھلنے کی سہولت حاصل ہے۔

برف سے ڈھکی پہاڑیوں سے کچھ ہی فاصلے پر گرم پانیوں کی جھیلیں آپ کو و
حیرت میں ڈال دیتی ہیں اور "سبحان اللہ" کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔

پانی اور برف سے متعلق جتنے بھی کھیل امریکہ میں کھیلے جاتے ہیں وہ سب آ
ایک ہی دن میں "ان لینڈ ایمپائر" میں دیکھنے کو مل جائیں گے۔

اس علاقے کا انگور اور سرکہ اور انگور سے بنی شراب "وائن" ساری دنیا میں
الگ شناخت رکھتے ہیں۔ سیبوں کے باغات دیکھئے اور دیکھتے چلے جائیے بڑے
شہروں سے چند منٹ کی ڈرائیو پر آپ کو جنگل مل جائیں گے۔ جہاں مخصوص قسم
"پکنک پوائنٹ" بنائے گئے ہیں۔ یہ جنگل سیاحوں کی جنت ہیں۔

دریا کے کنارے آباد شہر اور "سان برنارڈینو" کیلی فورنیا کے بہتر
انٹرنیشنل مراکز ہیں۔ ان شہروں میں خاصے کی چیز انگوروں کے وہ طویل و ع

باغات ہیں جو میلوں تک پھیلے چلے جاتے ہیں۔

سان برناڈیو اور اس کے مضافات میں کھیلوں۔ ثقافت اور انڈسٹری کے مراکز
قائم ہیں، یہیں امریکہ کا مشہور زمانہ "سوک لائیٹ اوپیرا" موجود ہے جہاں امریکہ کے
مانے ہوئے گلوکار اور ڈانسر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اس علاقے کی "بیس بال ٹیم"
جس کا نام "سپرٹ" ہے امریکہ کی بہترین ٹیم شمار کی جاتی ہے۔

بگ بیئر اور ایرو ہیڈ نامی جھیلوں کے کنارے وسیع و عریض جنگلات میں سیاحوں
کے لئے خصوصی دلچسپیاں پیدا کی گئی ہیں۔ جہاں کام و دہن کی تمام لذتیں ہمہ وقت پائی
جاتی ہیں۔

اونٹاریو کے علاقے میں اس خطے کی قدیم کھیتی باڑی کے مراکز موجود ہیں۔ یہ
علاقے زیتون اور انگور کی پیداوار کے لئے مشہور ہیں۔ یہاں بہترین سرکہ تیار کرنے
کی لیبارٹریاں بھی موجود ہیں۔

"پائینیر میموریل پارک" اس کاؤنٹی کا قدیم ترین پارک شمار ہوتا ہے جہاں کبھی
میکسکین اور ریڈ انڈین آباد تھے۔

شمال میں 36 مربع میل میں کیوکا مونگا کی پہاڑی چوٹیاں موجود ہیں۔ ان پہاڑی
چوٹیوں کی اونچائی 9 ہزار فٹ تک ہے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے کوہ پیماؤں کے لئے
چیلنج بنی رہتی ہیں اور سارا سال کوہ پیما یہاں آکر اپنا شوق پورا کرتے اور انہیں مسخر
کرتے رہتے ہیں۔

اس کاؤنٹی میں "لنکولن میموریل شرائن" موجود ہے جہاں ابراہام لنکن پر کتابوں،
تصاویر اور یادگار کا ذخیرہ موجود ہے۔ سان برنارڈینو کاؤنٹی میوزیم 1830ء میں قائم
ہوا تھا اور یہاں اس علاقے کی قدیم تاریخ سے متعلق معلومات کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ
موجود ہے۔

کیلیے فورنیا کی چوتھی کاؤنٹی کو "گریٹر لاس اینجلس ایریا" کہا جاتا ہے۔

4083 مربع میل پر پھیلی لاس اینجلس کاؤنٹی کو کیلیے فورنیا کی رنگا رنگ تفریحات اور ثقافتی سرگرمیوں میں مرکزی مقام کی اہمیت حاصل ہے۔ اس کاؤنٹی Entertainment Capital of the World کہا جاتا ہے۔ اور تجربہ اس دلالت بھی کرتا ہے۔

تھیٹر، میوزک، آرٹ، کلچر، میوزیم، سینما ہاؤس، ٹی وی سنٹرز، تصاویر کشی کھیلوں کے لئے لاس اینجلس ساری دنیا میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ اس شہر کو "اولمپک شہر" کا اعزاز بھی حاصل ہو چکا ہے۔

9 ملین آبادی والا یہ علاقہ کیلیے فورنیا کا سب سے بڑا میٹروپولیٹن ایریا اور امریکہ کا دوسرا بڑا میٹروپولیٹن شہر کہلاتا ہے۔

لیکن ----

یہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

جھیلیں، سمندر، پہاڑ، صحرا جہاں سارا سال دھوپ اور گرمی پڑتی ہے۔

پیراکی اور ماہی گیری سے خریداری اور قدرتی مناظر کی نظارہ کشی کے لئے اے "(لاس اینجلس) سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں۔

1781ء میں یہاں میکسیکو سے گیارہ خاندان آکر آباد ہوئے تھے جنہیں کے گورنر فلپ ڈی نیو نے یہاں بھیجا تھا۔ آپ کو یہاں پرانے کیلیے فورنیا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

اس پارک کے مشرق میں ایل اے کا یونین سٹیشن واقع ہے جو امریکہ کا آخری بڑا ریل روڈ ٹرمینل سمجھا جاتا ہے 1939ء میں بنایا گیا یہ ٹرمینل آج تک اپنی بہتر

کارکردگی کے ساتھ موجود ہے جہاں "ایلٹرک ٹرین" رواں دواں رہتی ہے۔

"ایل اے" کی سب سے بڑی خوبی جو کسی بھی سیاح کو اپنی طرف متوجہ کرے گی یہاں کی رنگا رنگ ثقافت ہے۔ سٹیٹ ہسٹاریکل پارک میں موجود اولیویرا سٹریٹ Oluera یہاں کی قدیم ترین سٹریٹ ہے۔ ایک بلاک لمبی مکسیکن مارکیٹ میکسیکن ہینڈی کرافٹ کا مرکز ہے جہاں آپ کو میکسیکو کی مصنوعات ہی نہیں کھانے اور مکمل ماحول بھی ملتا ہے۔

اس سے چند بلاک دور "چائنا ٹاؤن" واقع ہے۔

یوں تو امریکہ کے بیشتر شہروں میں چائنا ٹاؤن موجود ہیں لیکن ایل اے اور سان فرانسسکو کا چائنا ٹاؤن اپنی مثال آپ ہے۔ اس ٹاؤن میں آپ کو ہانک کانگ، تائیوان، چین اور ویت نام، کمبوڈیا اور شرق اوسط کے دیگر ممالک میں بسنے والے چینی نژاد عوام کا انبوہ کثیر تو نظر آتا ہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چینی ریسٹورانوں، تجارتی مراکز اور ثقافتی سنٹرز کا سلسلہ بھی چاروں طرف پھیلتا چلا گیا ہے۔

چینی اپنے نئے سال کے آغاز پر جن تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں ان کا شاندار نظارہ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے اسی موقعہ پر مختلف سوانگ رچا کر اور بھوتوں والا لباس پہن کر یہاں چین کے روایتی ناچ پیش کئے جاتے ہیں۔

سوک سنٹر کے نزدیک آپ کو ایک "چھوٹا ٹوکیو" آباد نظر آتا ہے جہاں چاروں طرف چپٹی ناک اور چھوٹے قد والے جاپانیوں کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں جاپانی ریسٹورینٹ، شراب خانے، دکانیں، ہینڈی کرافٹس کے علاوہ مخصوص طرز کے جاپانی ثقافت کے مرکز نظر آتے ہیں جہاں جاپانی طرز کے ناچ، گانے اور دیگر ثقافتی پروگرام دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ہر سال اگست کے وسط میں یہاں شاندار ثقافتی میلہ لگتا ہے جہاں جاپانی باشندے

اپنے روایتی تہوار کو بڑے شان و شوکت سے مناتے ہیں۔

اپنی بڑی سفید رنگ کی گھڑی والے مینار کے ساتھ فارمز مارکیٹ اس شہر کی شناخت بن چکی ہے۔ کبھی یہاں غربت کے ہاتھوں تنگ آئے 18 کسانوں پر رحم کھا کر مقامی لوگوں نے انہیں سٹال لگا کر اپنی سبزیاں بیچنے کی اجازت دی تھی۔ آج یہ جگہ ایک منڈی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جہاں 160 سٹالوں پر کیلیفورنیا کی تازہ سبزیاں، پھل اور ہمہ اقسام کا گوشت فروخت ہوتا ہے۔

اس مارکیٹ کے گرداگرد ریسٹورانوں کا ایک جال پھیلتا چلا گیا ہے جن کی خوبی یہ ہے کہ وہاں جو بھی چیز ملے گی وہ تازہ ہوگی --- فریج میں محفوظ نہیں ہوگی۔

○

لاس اینجلس سارا سال کھیلوں کی سرگرمیوں کا مرکز بھی بنا رہتا ہے۔

"بیس بال" کے شائقین کے لئے "ڈوگرز" ہیں۔ جن کا قیام ہی "ڈوگرز سٹیڈیم" میں رہتا ہے اور یہاں سارا سال بیس بال کھیلا جاتا ہے۔ 1984ء میں جہاں اولمپک گیمز ہوئی تھیں اسے "ایل اے ریڈرز" کے فٹ بال مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

تین گھڑ سواری کے پارک بھی یہاں موجود ہیں جن کے نام "سینٹا انیتا پارک" "وڈ پارک اور ال جالسن پارک ہیں اور وہ ریس ٹریک بھی جہاں گھڑ سواری ہوتی اور کھیلا جاتا ہے۔ "لاس اینجلس" کے "لیکرز" (باسکٹ بال ٹیم) ساری دنیا کے کھیل کے شائقین کے لئے ایک قابل عزت نام ہے۔

میوزک، ڈانس، اوپیرا اور تھیٹر کا حسین سنگم یہاں ایک بڑے کمپلیکس کی میں 1946ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں بیک وقت 3197 تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ جو میوزک کے پروگراموں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

2071 سیٹوں کا ایک تھیٹر بھی اسی کمپلیکس میں قائم ہے جب کہ 742 سیٹ

ایک الگ ہال میوزیشنوں کی تربیت کے لئے موجود ہے۔

میوزک سنٹر کے جنوب میں چند بلاک کی دوری پر آیل اے تھیٹر سنٹر موجود ہے جہاں ۴ بڑے بڑے ہالوں میں سارا سال سٹیج ڈرامے چلتے رہتے ہیں۔

○

"ایل اے" کے میوزیم بھی مثالی ہیں میوزک سنٹر سے ایک بلاک کے فاصلے پر میوزیم آف کونمپریری آرٹ موجود ہے۔ یہ میوزیم پہلے ڈاؤن ٹاؤن میں عارضی بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا۔

لیکن --- بعد میں اسے جاپان کے مشہور ماہر تعمیرات "اراتا آسوزاکی" نے شاندار عمارت میں تبدیل کر دیا۔

1986ء میں اس عمارت میں امریکہ کے زمانہ امن کی بہترین پینٹنگز جمع کر دی گئی ہیں جس گیلری میں یہ تصاویر رکھی گئی ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی روشنیوں سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ بات صرف دیکھنے سے سمجھ آتی ہے کہ کس طرح فنی مہارت کے ساتھ سورج کی روشنیوں کو منعکس کر کے گیلری میں اتارا گیا ہے۔

ڈاؤن ٹاؤن کے جنوب میں واقع "ایکوزیشن پارک" لاس اینجلس کے دو بہترین عجائب گھروں میں سے ایک ہے۔ یہاں کی نیچرل ہسٹری میوزیم کو مغرب کا سب سے بڑا میوزیم کہلانے کا اعزاز حاصل ہے جہاں جانوروں کو ان کے قدرتی ماحول کے ساتھ حنوط کر کے رکھا گیا ہے اور امریکہ کی جنگلی حیات کے تین عظیم مظاہر یہاں موجود ہیں۔

یہاں ایک ہال میں 65 ملین سال پہلے کے پرندوں اور جانوروں کی شباہتیں محفوظ کی گئی ہیں جس کی مثال شاید ہی کسی اور میوزیم میں دکھائی دے۔

دوسرا بڑا میوزیم سائنس اور انڈسٹری سے متعلق اشیاء کا ذخیرہ اپنی مکمل معلومات

اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اس میں فضائی ٹیکنالوجی، ایوی ایشن، حسابیات، برقیات
اور فزکس سے متعلق معلومات کے ذخائر جمع ہیں۔

ڈاؤن ٹاؤن کے مغرب میں لاس اینجلس کاؤنٹی میوزیم آف آرٹس موجود ہے
تین عظیم الشان عمارات میں یہ میوزیم 1965ء میں قائم ہوا تھا۔ اس میوزیم میں
امریکن پینٹنگز کے بہترین نمونے، آرمنڈ ہیمر کے جمع کردہ رومن گلاس کا مجموعہ اور
ہندوستان اور اسلامی دنیا کے آرٹ کے بہترین نمونے یہاں موجود ہیں۔

○

اس کاؤنٹی کا دوسرا اہم مقام ہالی وڈ ہے----!!
ہالی وڈ کو دنیائے فلم کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ "ماؤنٹ لی" پہاڑی سلسلے کا
مشہور عالم "ہالی وڈ" کا نشان سمجھا جاتا ہے---1963ء میں 30 فٹ کے بڑے بڑے
الفاظ پر مشتمل یہ نام یہاں لکھا گیا تھا یہاں جو الفاظ لکھے گئے ہیں وہ lollyWood
Land ہالی وڈ لینڈ ہیں جو بعد میں مختصر ہو کر ہالی وڈ رہ گیا۔
دنیا کے گوشے گوشے سے فلموں کے شائقین جوق در جوق اپنے پسند
اداکاروں کو جنہیں وہ پردہ فلم پر متحرک دیکھتے ہیں ان کی اصل حالت میں دیکھنے
لئے یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔
ہالی وڈ کی گلیوں اور بازاروں کے کسی نہ کسی کونے میں آپ کو دنیائے فلم کا کوئ
کوئی عظیم اداکار یا اداکارہ عام انسانوں کی طرح چلتا پھرتا نظر آئے گا۔افسانوی دنیا
ان مکینوں کو نزدیک سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔
"ہالی وڈ بلیوارڈ" کے چاروں اطراف سائیکا مور Sycamore اور گوور wer
وائن سٹریٹ، سن سیٹ اور یوکا Yucca پر آپ کو وہ عمارات دکھائی دیتی ہیں
دنیائے فن کے وہ ستارے رہتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں فلم، ٹی وی، ریڈ

یوزک کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔
1961ء میں چیمبر آف کامرس نے یہاں جو "واک آف فیم" قائم کی تھی وہاں
ب 1800 فلمی ستارے موجود ہیں اور آئے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔
ہالی وڈ کے جنوب میں ہالی وڈ سٹوڈیوز اور میوزیم موجود ہیں۔

○

اس کاؤنٹی کا "گرافتھ پارک" امریکہ کا سب سے بڑا 4400 ایکڑ رقبے پر مشتمل
رائیویٹ پارک ہے اس پارک کے ٹینس کورٹس، پونی رائیڈ Pony Prides میری
راؤنڈ، سوسر فیلڈ، پکنک ایریا اور 50 میل کا کوہ پیمائی سلسلہ اور گھڑ سواری کا میدان بے
ثال ہے۔
1966ء میں قائم ہونے والا لاس اینجلس چڑیا گھر بین الاقوامی شہرت حاصل کر
کا ہے۔یہاں 2 ہزار سے زائد جانوروں کو ان کے قدرتی ماحول میں رکھا گیا ہے۔
نومبر 1988ء میں اس پارک میں 54 ملین ڈالر کی لاگت سے
Gene Autry Western Herita میوزیم کا افتتاح ہوا جس کو دیکھنے کا مجھے
ی موقعہ ملا تھا۔
اس میوزیم میں مغربی امریکہ کی مکمل تاریخ سپین کے قبضے سے موجودہ دور تک
فوظ کر لی گئی ہے۔

○

"بیورلے ہلز" اس کاؤنٹی بلکہ امریکہ کے امیر ترین لوگوں کا رہائشی علاقہ ہے۔
ہاں شاید دنیا کے مہنگے ترین مکانات بنائے جاتے ہیں۔ یہاں کی "روڈیو ڈرائیو
Rodeo Drive لندن کی بونڈ سٹریٹ، نیویارک کی ففتھ ایونیو اور پیرس کی Rue
du Faubour سینٹ میونور کی طرح کا عظیم اور مہنگا ترین شاپنگ ایریا ہے۔

یہاں کے سٹورز میں دنیا کے قدیم ترین نوادرات برائے فروخت رکھے جاتے ہیں اس کاؤنٹی میں سانٹا مونیکا کے خوبصورت ساحل مشرقی ممالک کے سیاحوں کی توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کرتے ہیں۔

میٹا کیٹالینا کا مشہور آئس لینڈ بھی کیلے فورنیا کی اسی کاؤنٹی میں شامل ہے اس کے علاوہ سان فرنانڈو ویلی، پاساڈینا اور "اینٹی لوپ ویلی" بھی شامل ہے جہاں موسم بہار میں کئی ایکڑ رقبے پر آپ کو گولڈن کیلے فورنیا پوپی Poppies کے کھیت لہراتے نظر آئیں گے۔

حیران نہ ہوں یہ افیم کے پھول نہیں بلکہ کیلے فورنیا کے "سٹیٹ فلاور" ہیں۔

○

قدرت نے یوں تو روئے زمین کے ہر کونے کو کسی نہ کسی نعمت سے نوازا ہے۔

لیکن ----!

کیلے فورنیا میں قدرت کی عنایات کے وہ وہ مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ انسانی حیرت گم ہو کر رہ جائے۔

ایک ہی سٹیٹ میں اگر ایک جگہ برف ہے تو اس سے چند میل دور کھولتا ہوا پانی اور صحرا بھی موجود ہے۔

"ڈیزرٹ" بھی کیلے فورنیا کی ہی ایک کاؤنٹی ہے۔

میلوں پھیلتے صحرا اور ان میں کیکٹس کے خودرو پودے اور درخت کبھی نہیں بھلائے جا سکتے۔ اسی کاؤنٹی میں "ڈیتھ ویلی" موجود ہے۔

اب کچھ ذکر ہو جائے ایک اور انتہائی دلچسپ کاؤنٹی "سان فرانسسکو بے ایریا" کا۔

میں نے سان فرانسسکو جانے کے لئے فلاڈلفیا سے اپنے دوست ڈاکٹر گریوال کے پاس "ٹریسی" جانا تھا گویا اس وقت میں امریکہ کے ایک کنارے "اٹلانٹک" پر تھا

مجھے دوسرے کنارے پیسیفک پر پہنچنا تھا۔

مجھے سب سے پہلے کیلے فورنیا کے شہر ٹریسی جانا تھا جس کے نزدیک سٹاکٹن میں وہ تاریخی گوردوارہ موجود ہے جہاں سے 1913ء میں "غدر تحریک" کا آغاز ہوا تھا۔ غدر پارٹی کے کردار سے بحث مقصود نہیں لیکن اپنے زمانے میں چلنے والی اس زیر زمین تحریک نے بھی آزادی کی لہر میں اپنا ایک اہم رول ادا کیا ہے جس کو نظر انداز کرنا تاریخ سے بے اعتنائی برتنے کے مترادف ہوگا۔

امریکی ائرلائن کی فلائٹ نمبر 1009 پر صبح ساڑھے سات بجے سوار ہو کر میں سوا س بجے ڈلاس پہنچ گیا۔ اس بات کا خیال رہے کہ امریکہ کے مختلف شہروں میں ٹائم کا رق ہے۔ نیویارک سے کیلے فورنیا کا وقت تین گھنٹے آگے ہے اسی طرح ڈلاس ایک ھنٹہ آگے ہے۔

ڈلاس سے منسلک فلائٹ کے ذریعے میں مقامی وقت کے مطابق تقریباً پونے یک بجے آک لینڈ پہنچ گیا وہاں ورلڈ سکھ نیوز کے مسٹر بھلر میرے منتظر تھے۔

○

بھلر صاحب زندہ دل سکھ ہیں۔ کبھی بھارت میں اعلیٰ سروسز میں اپنا سکہ منوایا اور لایا کرتے تھے جب سے بھارت سرکار نے سکھوں سے غیر انسانی سلوک شروع کیا ل کے بعد سے سروسز کو خدا حافظ کہہ کر امریکہ چلے آئے اب امریکہ میں سکھوں کے سب سے زیادہ مقبول اور شاید واحد پرچے کے عملہ ادارت سے منسلک ہیں۔ آک نڈ سے ٹریسی تک ڈیڑھ دو گھنٹے کی ڈرائیو تھی، تمام راستے بھلر صاحب اپنی شگفتگی کے ہر دکھاتے آئے۔

اس راستے پر سفر کرتے ہوئے آپ کو یوں لگتا ہے جیسے آپ پنجاب کے میدانی اقوں میں سفر کر رہے ہوں۔ کہیں تو پوٹھوہار کی طرح سڑک کے دونوں اطراف

پہاڑیاں دکھائی پڑتی ہیں اور کہیں دونوں طرف سرسبز و شاداب ہرے بھرے کھیت۔ کہیں راستے میں تھوڑی گرمی اور کہیں شدید سردی، ہر طرح کا موسم، لوگ، ماحول اور انتہائی زرخیز زمین والی امریکہ کی یہ ریاست واقعی بے مثال ہے یہی وجہ ہے کہ شاید امریکہ کی اہم ترین شخصیات ریٹائرمنٹ کے بعد اس ریاست کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔

بھلر صاحب کی معیت میں جلد ہی میں ٹریسی میں مشہور سرجن اور اپنے میزبا
دوست ڈاکٹر گریوال تک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر گریوال اس علاقے میں امراض قلب کے وا
اور مستند سرجن تسلیم کئے جاتے ہیں ان کی زندگی بے حد مصروف ہونے کے باو
ڈاکٹر گریوال ایک سکھ ہونے کے ناطے کبھی اپنی قومی ذمہ داریوں سے غافل نہ
رہے اور اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود سکھوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے کے
ہر اہم موقع پر موجود ہوتے ہیں۔

میں تو ڈاکٹر گریوال کے گھر آرام کرنے چلا گیا۔ ان کی واپسی شام گئے ہوئی۔
کو مقامی صحافیوں اور سکھ زعما نے میرے ساتھ ایک تقریب ملاقات کا اہتمام ک
جہاں ورلڈ سکھ آرگنائزیشن کے تقریباً سب ہی اہم لیڈر موجود تھے اس محفل ک
خاص بات اس کی سادگی تھی 84ء کے بعد سے سکھوں نے اپنے مذہب کو حرز
لیا ہے اور شراب و کباب سے تقریباً تائب ہو چکے ہیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ امریکی روایات کے برعکس یہاں شراب نام کی کو
موجود نہیں تھی۔ سکھوں کو اس معاملے میں اب خاصی عقل آچکی ہے اس
بھارتی اور پاکستانی سیاست کے حوالے سے بہت سی باتیں ہوئیں غیر ممالک می
والے ہر شخص کو اپنے ملک اور قوم سے متعلق کچھ زیادہ ہی تشویش لاحق رہتی۔
ان لوگوں کا مسئلہ تھا۔

ایک صحافی ہونے کے ناطے وہ مجھ سے حالات کرید کرید کر دریافت کرر

جاننا چاہتے تھے کہ مغربی ذرائع ابلاغ سے ان تک پہنچنے والی خبروں کی حقیقت کیا ہے۔

رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ امریکہ میں رات کے بارہ ایک بجے تک لوگ جاگتے رہتے ہیں۔ اگلے روز ویک اینڈ شروع تھا اور ڈاکٹر گریوال نے مجھے سان فرانسسکو دکھانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

میں نے دنیا تو نہیں دیکھی لیکن سنا ہے کہ سان فرانسسکو دنیا کے خوب صورت ترین مقامات میں سے ایک مقام ہے امریکہ آکر سان فرانسسکو نہ دیکھنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ پاکستان میں آکر لاہور دیکھنے سے محروم رہ جانا۔ ڈاکٹر گریوال کو ہفتہ وار تعطیل تو نہیں ہوتی لیکن انہوں نے میرے لئے بطور خاص وقت نکالا تھا خود ڈاکٹر صاحب بھی شاید ایک عرصے سے کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے۔

یوں تو ٹریسی بھی ایک چھوٹا سا خوبصورت اور انتہائی پر فضا مقام ہے لیکن سان فرانسسکو کی بات ہی اور ہے اور رات دیر گئے سونے کے باوجود ہم صبح جلدی اسی لئے اٹھ گئے تھے کہ ہمیں سان فرانسسکو جانا تھا۔

○

صبح میں اپنے میزبان کے ساتھ سان فرانسسکو جا رہا تھا۔ جو یہاں سے دو گھنٹے کی دوری پر واقع ہے۔ امریکہ میں فاصلہ بتانے کے لئے عموماً وقت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے مثلاً فلاں جگہ کتنی دور ہے؟ کا جواب اکثر یہی ہوتا ہے کہ اتنے گھنٹے کی ڈرائیور ہے؟ ٹریسی سے سان فرانسسکو تک سڑک کے دونوں اطراف خوبصورت نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب امریکہ میں آسٹریلیا کی طرح پن چکی کا تجربہ بھی کیا جا رہا ہے۔ جو خاصا کامیاب ہے یہاں ایک خاص علاقے میں تیز ہوائیں چلتی ہیں جس کے سبب سے وہاں پہاڑیوں پر پن چکیاں لگی دکھائی دے رہی تھیں۔

ان چکیوں کی مدد سے یہ لوگ اپنی ضرورت کے مطابق اچھی خاصی انرجی حاصل

کر لیتے ہیں۔

انرجی صرف پاکستان ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیا کا مسئلہ ہے لیکن دنیا کے ہر ملک نے اپنے مقدور بھر ذرائع کے ساتھ اس کا ممکنہ حل تلاش کیا ہے۔ یہ صرف پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ ایک اسلامی ملک ہونے کے ناطے ہمارے پرامن ایٹمی پروگرام کو اسلام دشمن طاقتیں ہدف تنقید بناتی رہتی ہیں حالانکہ انرجی کے حصول کے لئے پاکستان کا ایٹمی استعداد حاصل کرنا ناگزیر ہے کیونکہ مستقبل میں اس کے بغیر ہم بہت بڑے بحران کا شکار ہو سکتے ہیں۔

امریکہ میں ہی نہیں دنیا کے ہر ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملک میں توانائی کے حصول کے لئے ایٹمی توانائی اور سولر انرجی کے حصول پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ خدا کرے ہ بھی سولر انرجی کی قدرتی دولت کو حاصل کرنے کی استعداد پیدا کر سکیں۔

سان فرانسسکو میں داخل ہونے کے لئے "بے برج" سے گزرنا پڑتا ہے یہ دنیا کے طویل ترین پلوں میں ایک پل ہے جس کی مضبوطی اور خوبصورتی بے مثال ہے۔ اس پل کے دونوں اطراف سے شہر کا نظارہ بڑا مسحور کن ہے سان فرانسسکو ک امریکہ میں "ائرکنڈیشن شہر" کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہاں کا موسم ہے جو عموماً خوشگوا رہتا ہے نہ زیادہ سردی نہ زیادہ گرمی۔ شہر میں داخل ہوں تو آپ کو ساری دنیا سے آ والے قسم قسم کے لوگ اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو ملیں گی۔

سب سے پہلے نزدیکی "بے" پر پہنچے۔ جہاں سے ٹکٹ خرید کر ایک چھوٹے ج کے ذریعے سان فرانسسکو کے تقریباً سب ہی جزیرے اپنی تاریخ سمیت آپ کو د اور سننے کو مل جاتے ہیں۔

اس بحری سفر کے دوران گولڈن گیٹ برج کے نیچے سے گزرنے کا موقع بھ یہ دنیا کا ایک شاندار پل ہے جس کے نیچے سے سوائے "انٹرپرائز" کے دنیا کا ہر

ہاز گزر سکتا ہے۔ انٹرپرائز کو یہاں سے گزرنے کی اجازت کیوں نہیں؟ اس کا سبب تو ریکن نیوی ہی بتا سکتی ہے لیکن اس بات میں شک نہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا بحری ڑہ بھی سمندر میں بنے اس پل سے گزر سکتا ہے۔

اس بحری سفر میں تاریخی نوعیت کے جزائر بھی دکھائے جاتے ہیں یہاں جزائر ں وہ عقوبت گھر اور قید خانے بھی واقع ہیں جو اب امریکہ کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں یہاں آزادی کے پروانوں کو خطرناک قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا اور جہاں ے فرار کی صورت میں سوائے موت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا تھا۔

انسانی تاریخ بہیمیت اور ظلم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے ایسے مظاہر دنیا کی ہر م اور ہر خطے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آج کے مہذب امریکہ کو دیکھنے کے بعد بڑی نکل سے یقین آتا ہے کہ ان جزائر میں کبھی ایسے وحشی اور غیر مہذب لوگ بھی آباد ئے اور یہاں کے انسان کو ایسے ایسے بھیانک مظالم اور جبر کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔

سمندر میں موجود چھوٹے چھوٹے جزائر میں واقع پہاڑیوں پر بنے یہ قید خانے ریکہ کے ماضی کی تاریخ ہیں افسوس اپنا ماضی آج سپر طاقتیں تیسری دنیا میں دہرا ی ہیں اور ہر طاقتور ملک غریب اور کمزور ملک کو اپنے استحصال اور جبر کے جبڑوں میں ڑے ہوئے ہے۔

اس سفر میں آپ کو تاریخی نوعیت کے بحری جہاز بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں یں مشہور عالم "بلوکلوتھا" نامی مرچنٹ شپ بھی دکھایا گیا جو 1866ء میں تیار ہوا تھا راپنے زمانے کے عظیم ترین بحری جہازوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

سان فرانسسکو کے نیشنل میری ٹائم میوزیم میں ایسے تاریخی نوعیت کے جہاز ؛جود ہیں۔ جن کو گھوم پھر کر دیکھنے کی اجازت ہے لیکن مفت نہیں۔ امریکہ میں مفت ہ نہیں ملتا۔ الا یہ کہ ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد اگر آپ اپنے سامان کے لئے دستی

ٹرالی بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایک ڈالر مشین میں ڈالنے کے بعد آپ کو مل سکتی
ہے بصورت دیگر اپنا سامان سر پر اٹھائیے یا فرش پر گھسیٹئے۔

سان فرانسسکو میں ساحل سمندر پر جہازوں میں خوبصورت ریستوران بنائے
گئے ہیں۔ جہاں کام و دہن کی لذت کے تمام سامان موجود ہیں میں ان کا بھرپور نظارہ
نہیں کر سکا کیونکہ یہ سب میرے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ خدا کا شکر ہے میں پاکستانی
مسلمان ہوں۔

O

گولڈن گیٹ پارک ایک تاریخی اور طویل و عریض پارک ہے جہاں کی ایک ایک
شے مسحور کن اور قابل توجہ ہے سب سے پہلے "کنزرویٹری" سے سابقہ پڑتا ہے ہری
ہری گھاس پر دنیا بھر کے پھول اکٹھے کر دیئے گئے ہیں جن کے پس منظر میں سفید رنگ
کی خوبصورت بلڈنگ اور اس کی تعمیر کا انداز کسی بھی دل والے کا دل موہ لینے کے لئے
کافی ہے۔

گولڈن گیٹ پارک پر ہی ایشین آرٹ میوزیم قائم ہے۔ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس
میوزیم میں ایشیائی آرٹ کے شاہکار رکھے ہیں شاید ہی کسی ایشیائی ملک میں اتنا شاند
میوزیم دیکھنے میں آتا ہو۔ گولڈن گیٹ پارک کے ایک حصے میں جاپانی ٹی گارڈن دیکھنے کا
چیز ہے۔ اس گارڈن میں داخل ہونے کے بعد یہاں لکڑی کی چھجے دار عمارات دیکھ کر
آپ کو فوراً احساس ہو جائے گا کہ آپ جاپان کے کسی باغ میں گھوم پھر رہے ہیں۔

اسی طرح یہاں کا ڈوینگ میوزیم شرق اوسط جاپانی اور چین کے شاہکاروں
مزین ہے۔ گولڈن گیٹ پارک کا میوزک کنکورس اور گھنے جنگل والا حصہ غرض کہاں
کہاں کی بات کی جائے ہر مقام اپنی ایک انفرادیت ایک تاریخ رکھتا ہے۔
سان فرانسسکو میں آنے کے بعد اگر آپ نے کروکڈ سٹریٹ نہیں دیکھی تو

ں دیکھا دنیا بھر کے سیاح یہاں آتے ہیں اس سٹریٹ کو پیچدار گلی کا نام اس کی عجیب و
یب ساخت کی بنا پر دیا گیا ہے۔

یوں تو سارا سان فرانسسکو پہاڑی پر واقع ہے لیکن یہ گلی خاص طور پر اتنی ٹیڑھی
ھی اور اونچی نیچی ہے کہ اسے دیکھ کر قدرت کی صناعی پر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔
ڈاکٹر گریوال کے ساتھ کار میں بیٹھا جب میں گلی میں گھوم رہا تھا تو مجھے بے ساختہ
ٹ آباد کی پہاڑی سڑک یاد آ رہی تھی لیکن کروکڈ سٹریٹ اس پہاڑی سڑک کی
ح کشادہ نہیں ہے بلکہ ایسی خمدار اور سانپ کی طرح بل کھاتی اوپر سے نیچے کی
ف آتی ہے کہ اس پر ڈرائیونگ کرنا بڑی مہارت کا کام ہے یوں تو امریکہ کے قریباً
بڑے شہر میں چائنا ٹاؤن موجود ہیں لیکن سان فرانسسکو کے چائنا ٹاؤن کی نظیر شاید
کہیں اور مل سکے۔

چائنا ٹاؤن میں داخلے سے پہلے ایک بڑا دروازہ آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول
تا ہے لیکن یہ کوئی لکڑی کا دروازہ نہیں بلکہ دو پلروں پر چھوٹی سی چھت بنا کر اس پر
نی تصاویر اور نقش نگاری کے ذریعے ان کی انفرادیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس وسیع و
یض ٹاؤن میں گلیوں اور سڑکوں کا ایک جال سا بچھا ہے جس پر سفر کرتے ہوئے
پ چین کی تہذیب و ثقافت کو زندہ روپ میں موجود پائیں گے یہاں کے چائنیز
یسٹورینٹ اپنی خاص شہرت کی وجہ سے سارے امریکہ میں مشہور ہیں۔

سان فرانسسکو میں بھارت نے اپنا قونصل خانہ کھول رکھا ہے جس سے ملحقہ
ڈنگ میں غدر تحریک کی یادگار محفوظ ہے دراصل یہ وہ عمارت ہے جہاں سے غدر
حریک نے اپنا اخبار جاری کیا تھا یہاں اس زمانے کی بہت ہی اس تحریک سے متعلقہ
ادگاریں وابستہ ہیں جن پر بھارتی حکومت قابض ہے۔

O

غدر تحریک کے واحد زندہ غازی بابے مکھن سنگھ نے اس سلسلے میں جو کچھ بتایا
کا ذکر میں اگلی نشست میں کروں گا مختصر بات یہ ہے کہ اس یادگار کو بجائے غدر تحر
کے لوگوں کو سونپنے کے امریکی حکومت نے بھارت سرکار کے حوالے کر دیا ہے ج
ہندو نے اپنی ذہنیت کے مطابق اصلی تاریخ کا تیاپانچہ کر کے اپنی علیحدہ تاریخ تیار کر لی
ہے۔ جس سے بابا مکھن سنگھ نے علیحدگی کا اعلان کر رکھا ہے۔
اس کا کہنا ہے کہ غدر تحریک کا سب سے بڑا دشمن گاندھی تھا اور انگریزوں نے
جن ہندو جاسوسوں کو ہم میں داخل کیا تھا جنہوں نے اس تحریک کو اپنی غدر داریوں ک
وجہ سے تباہ کر دیا اور جن کو ہم تحریک کے غدار کہتے ہیں ہندو سرکار نے تاریخ سے
دھاندلی کر کے انہیں غداروں کو ہیرو بنا رکھا ہے۔
رات گئے ہم ٹریسی واپس لوٹ آئے---!!
اگلے روز کیلی فورنیا سے اگلی ریاست نواڈا کے مشہور عالم شہر "رینو" جانے کا
پروگرام بنا۔ "رینو نواڈا کا مشہور تفریحی مقام ہے لیکن یہاں جانے کے بعد احساس ہو
کہ یہاں کی واحد اور یکتائے مثال تفریح یہاں کے جوا خانے ہیں۔ بلا شبہ "رینو" کے
جوا خانے لاس ویگاس کی طرح دنیا بھر کے امیر کبیر جوئے بازوں کی توجہ اپنی طرف
مبذول کرنے کا سامان اپنے پاس رکھتے ہیں۔
اس سے پہلے میں اٹلانٹک سٹی دیکھ چکا تھا لیکن یہاں کا منظر دیدنی تھا۔
یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر عالم اسلام کی بے بسی اور بد قسمتی کا شدت سے احسا
ہوتا ہے۔ یہاں بڑی بڑی امارات کے شہزادگان ایک ایک رات میں ہزاروں ڈالر لٹا
داد عیش دیتے اور مغربی ساہوکاروں کی جھولیاں بھرتے ہیں۔ ان نامی گرامی جوا خانو
میں انسانی نفسیات کے مکمل مطالعے کے بعد ایسے ایسے خوبصورت پھندے ڈالے
ہیں جن سے بچ نکلنا کار دارد ہے۔ جو ایک مرتبہ یہاں داخل ہوا دوبارہ ویسا برآمد نہ

تا۔ یہاں لوگ اپنی دانست میں شاید جیتنے کے لئے آتے ہوں گے لیکن یہاں سے
ت کر کوئی نہیں جاتا۔ سب ہار کر جاتے ہیں کیونکہ یہاں نظام ہی ایسا پیچیدہ لیکن بظاہر
ب نظر اور ہوسناک ترتیب دیا گیا ہے جس میں کوئی جیت نہیں سکتا سوائے ان
وں کے جن کا "جیک پاٹ" لگ جائے۔ اتنے اتنے بڑے جوا خانے ہیں کہ ایک میں
ں جائیے تو رات تک باہر نکلنے کی مہلت ہی میسر نہیں آتی۔
اپنے دام تزویر میں لوگوں کو پھانسنے کے لئے طرح طرح کے جال جوا خانوں کے
ان کی طرف سے بچھائے جاتے ہیں مثلاً آپ اگر ایک مخصوص وقت تک اس شہر
ے کسی بھی جوا خانے میں جوا کھیلیں تو آپ کو پارکنگ مفت فراہم کی جائے گی۔ اگر
ید زیادہ وقت کے لئے کھیلیں تو ڈنر اور لنچ مفت ملے گا۔ اور کچھ وقت گزاریں تو رات
ارنے کے لئے کمرہ بھی مفت فراہم کیا جائے گا۔ دوران کھیل آپ کو ہمہ اقسام کے
روبات اپنی جگہ پر ملتے رہیں گے۔ سبب اس کا یہی کہ آپ کو تھکن یا بیزاری کا
ساس نہ ہونے دیا جائے کم از کم اس وقت تک جب تک آپ قلاش نہ ہو جائیں۔
یہاں کی مشہور اور چونکا دینے والی شے کا نام ہے۔ "ہیلو ہالی وڈ ہیلو" جو دو گھنٹے پر
تمل ایک شو ہے۔ اس شو میں واقعی ایسے ایسے کمالات پیش کئے جاتے ہیں کہ انسانی
رت گم ہو کر رہ جائے۔ آواز، روشنی اور سٹیج کا اس سے بڑھ کر خوبصورت استعمال
ید دنیا میں کسی اور سٹیج پر نہ کیا جاتا ہو۔
ایک منظر میں اگر کسی ساحلی علاقے کا ڈانس وہاں کی مخصوص منظر کشی کے ساتھ
ری ہے تو بمشکل ایک منٹ بعد صحرائی علاقے کا منظر اپنی تمام تر خصوصیات کے
اتھ آپ کو دکھائی پڑے گا۔ دو گھنٹے میں کم از کم چالیس تا پچاس مختلف آئیٹم پیش کئے
تے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ ہر آئیٹم وہی فنکار پیش کرتے ہیں جو اس مکمل شو کے لئے
صوص ہیں۔

جتنی پھرتی اور تنظیم کے ساتھ یہ لوگ اپنے لباس اور سٹائل کو تبدیل کرتے ہیں اس سے تو یہی احساس ہوتا ہے جیسے یہ فنکار کمپیوٹر سے نکل کر آ رہے ہوں۔ یہ برق رفتاری شو کے آغاز سے اختتام تک برقرار رہتی ہے اور کہیں بھی تسلسل ٹوٹنے کا احساس نہیں ہوتا شنید ہے کہ اس شو میں بھلے چالیس پچاس اداکار حصہ لیں لیکن اس کی ترتیب و تدوین میں سینکڑوں تکنیک کار حصہ لیتے ہیں اور یہ شو امریکہ کے مشہور ہدایت کار ترتیب دیتے ہیں۔

ٹریسی سے رینو تک سڑک کے دونوں اطراف مختلف موسم اور مختلف مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کہیں آپ کے دونوں اطراف دیو قامت پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں تو کہیں ڈھلوانوں پر سکیٹنگ کرتے امریکی نظر آتے ہیں۔ کہیں سڑک پر برف گر رہی ہے اور کہیں دھوپ اپنے مکمل جوبن کے ساتھ سایہ فگن ہے۔ امریکہ بدلتے موسموں اور رنگ برنگی دنیاؤں کا مالک ہے۔ اس کے سپر پاور ہونے کا احساس اس ملک کے طول و عرض میں گھومنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ایک خوبی جو امریکی اور یورپی قوموں میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ اپنے نوادرات، تاریخی مقامات اور کلچر سے ان کا عشق ہے۔ کسی ریاست میں کوئی بھی قابل دید مقام اگر ہے تو امریکیوں نے اس کی سج دھج کا مکمل اہتمام کر رکھا ہے اور ہر جگہ سیاحوں کے لئے بھرپور تفریح اور قیام و طعام کی سہولت بہم پہنچائی گئی ہے جب کہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ خانہ بالکل خالی ہے۔

○

خدا نے پاکستان کو قدرتی حسن کی جس بے پایاں دولت سے مالا مال کر رکھا ہے ا
پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ خصوصاً شمال مغرب میں پہاڑی سلسلہ اور شا
وادیاں جیسے سکردو، گلگت، کیلاش، سیاچن وغیرہ ہیں افسوس عالمی سطح پر نہ تو ان مقا
کی تشہیر کا کوئی خاطر خواہ بندوبست کیا گیا ہے نہ ہی مستقبل میں ایسی کوئی صورت د

پڑتی ہے۔ محکمہ سیر و سیاحت نے صرف ویو کارڈز شائع کرنے یا وقتاً فوقتاً اشتہارات شائع کروانے تک ہی اس سلسلے کو محدود کر رکھا ہے۔ نہ تو یہاں ڈھنگ کے ریسٹورنٹ تعمیر کئے گئے ہیں نہ ہی ٹرانسپورٹ کا کوئی خاطر خواہ بندوبست کیا گیا ہے۔ اگر ایسا کچھ ہے بھی تو وہ اتنا مہنگا ہے کہ عام آدمی کی دسترس سے ہی باہر دکھائی دیتا ہے۔

ساری دنیا گھوم جائیے۔ آپ کو وادی کیلاش جیسا قدرتی حسن کا شاہکار کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ لیکن افسوس آج وادی پر اسرار کی تہہ جوں کی توں پڑی ہے۔ جو آج سے ہزاروں سال پہلے موجود تھی۔ اس کے برعکس بیشتر یورپی ممالک اور امریکہ میں اگر کوئی بھی معمولی دلچسپی قدرت نے فراہم کی تھی تو ان لوگوں نے اس کو تراش خراش کر قابل دید بنایا ہے۔

رینو سے رات دیر گئے واپسی ہوئی۔ دسمبر کا مہینہ اور سرد موسم کی عذاب ناکیاں سڑکوں تک ہی محدود ہیں۔ یہاں گھروں کاروباری مراکز اور دفاتر میں موسم کے اثرات محسوس نہیں ہوتے۔ کیونکہ اندرونی ماحول موسم کے مطابق ترتیب دے لیا جاتا ہے۔ اگر ٹھنڈک یا گرمی ہو تو وہ باہر ہوتی ہے اندر موسم نارمل اور انسانی صحت کے مطابق ہوتا ہے۔

○

امریکہ میں مختلف تجارتی تنظیموں کے پیمانوں پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے وہاں کے تجارتی طبقہ میں اپنے اعلیٰ حکام کے استعمال کے لئے نجی ہوائی جہاز رکھنے کا رجحان عام ہے امریکہ کی ایک پرائیویٹ ہوائی سروسز ایسٹرن ایئر لائنز کے باس فرانسسکو ولارنیزو کا ذکر کرتا ہوں جس نے اپنے ہوائی سروس گروپ کو دیوالیہ پن کے دہانے تک بھی اپنے ہی ہاتھوں پہنچایا اور اتنی بھاری لیبر بے چینی پیدا کی جو بنا کر 1989ء میں پانچ دن کی ہڑتال کے بعد اس ہوائی سروس کے ملازم ٹی وی پر اس کا پیغام سننے کے لئے

میامی کے یونین ہال میں پہنچے تو ٹی وی کے سکرین پر لارنیزو کا چہرہ ابھرتے ہی انہوں نے بکرے بلانے شروع کر دیئے اور لارنیزو کو سننے سے انکار کر دیا۔

ایسٹرن ایئر لائنز وہی ہوائی سروس ہے جس کے ہوائی جہاز پر میں نے سان فرانسسکو سے لاس اینجلس تک کا اس وقت سفر کیا تھا جب کہ ایک دوسری ہوائی سروس میں ہڑتال کی وجہ سے میرے دورہ کا پروگرام درہم برہم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا لیکن بعد میں اسی ہوائی سروس میں ایسی لیبر بے چینی پیدا ہوئی کہ خود ایسٹرن کے وجود کے لئے ہی خطرہ پیدا ہو گیا میرے امریکہ سے لوٹنے کے بعد آخر کار ایسٹرن کے باس فرانسسکو لارنیزو کے سرمائے دارانہ رویہ کے خلاف اس کے ملازمین نے بھو ہڑتال کر دی۔

1989ء کے 20مارچ کے نیوز ویک میں لارنیزو کی کارگزاری کی جو تفصیل شائ کی گئی وہ سرمائے دارانہ استحصال کی منہ بولتی کہانی ہے۔ ہڑتالی مزدوروں کا کہنا تھا کہ ایسٹرن کو تو چاہتے ہیں لیکن لارنیزو کو نہیں جسے انہوں نے بے رحم اور لالچی قرار ان کے مطابق لارنیزو کا دماغ کسی شیطان کے کارخانہ سے کم نہیں تھا۔

ایسٹرن ایئر لائنز میں حالات بگڑنے کی وجہ لارنیزو کی دھن کی ہوس اس حد تک جا پہنچی کہ اسے امریکہ میں بدترین باس کے نام سے پکارا جانے لگا کیونکہ اس نے امریکی قانون کے چیپٹر ۱۱ کے تحت اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کرنے کی کوشش کی۔ حالات اس حد تک پہنچ گئے کہ زیادہ تر مبصرین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یا تو لارنیزو اپنے زیادہ تر روٹ اپنی سبار ٹینیٹ کانٹی نینٹل ایئر لائنز کو فروخت کر دے یا پھر ان تجارتی حریفوں کو جنہوں نے انہی دنوں "ایسٹرن" کی تجارتی سرگرمیوں میں ٹانگ اڑانی شروع کر دی تھی۔ یہاں تک کہ ایک مشہور ہوائی سروس ٹی ڈبلیو اے کے منتظمین نے لارنیزو کی تمام ہوائی سروس کے لئے اس سے بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔

اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے لارنیزو نے کہا تھا کہ وہ ایسٹرن کو چالو رکھنا چاہتا ہے۔ بھلے ہی یہ بہت چھوٹی کمپنی بن کر کیوں نہ رہ جائے لیکن ایسٹرن میں ہڑتال سے اس کے تئیں عوام کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا۔ اس کے ہوائی جہازوں کی بار بار رد ہونے الی پروازوں سے عوام کا اس میں باقی بچا ہوا اعتماد بھی اٹھ گیا امریکیوں کو لارنیزو کے رے میں اگر کچھ معلوم تھا تو وہ بس اتنا ہی کہ وہ ایک ایسا جرات مند صنعتکار ہے۔ جس نے جہاز رانی کے اصولوں میں "ڈی ریگولیشن" کئے جانے کا فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ جہاز رانی منعت کی سب سے بڑی ہستی کے روپ میں جانا جانے لگا تھا اور ۱۸ برس کی مدت میں ں نے امریکہ کی ہوائی سروسز پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ پہلے اس نے ایسٹرن ایئر لائنز پر بضہ کیا پھر کانٹی نینٹل پر اس کے بعد "پیپلز ایکسپریس" پر اور اس کے بعد اپنی ر پرست کمپنی "ٹیکساس ایئر" کو دنیا کی سب سے بڑی ہوائی سروسز کو کنٹرول کرنے الی میں تبدیل کر دیا۔ اس عمل میں اس نے بار بار یونینوں اور انڈسٹری کے قانونی اور سولی بندھنوں کی دھجیاں اڑائیں اور "یونین توڑ" کے روپ میں مشہور ہو گیا۔

لارنیزو کو جاننے والے لوگ اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے ہیں۔ اس کی رائیویٹ زندگی لوگوں کو بہت کم ہی دیکھنے کو ملی ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں کو جو ھ معلوم ہے وہ بس اتنا ہی کہ لارنیزو ایک بے حد پرائیویٹ قسم کا آدمی ہے اور اس کی نک کا حال یہ تھا کہ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ اس سے انٹرویو کرنے آیا اخبار نویس اپنے والات کا مرکز اس کی کمپنی کو نہ بنا کر اس کو بنانے والا ہے تو وہ اپنا انٹرویو اس اخبار لیں کے ساتھ عین آخری وقت پر بھی رد کر دیا کرتا تھا۔

جب نیوز ویک کے نامہ نگار نے اس سے پوچھا کہ اس پر کئے جانے والے ذاتی ملوں کا اس کی زندگی پر کیا اثر ہوا ہے تو اس نے بے حد سیدھے سادھے ڈھنگ سے

میامی کے یونین ہال میں پہنچے تو ٹی وی کے سکرین پر لارنیزو کا چہرہ ابھرتے ہی انہوں نے بکرے بلانے شروع کر دیئے اور لارنیزو کو سننے سے انکار کر دیا۔

ایسٹرن ایئر لائنز وہی ہوائی سروس ہے جس کے ہوائی جہاز پر میں نے سان فرانسسکو سے لاس اینجلس تک کا اس وقت سفر کیا تھا جب کہ ایک دوسری ہوائی سروس میں ہڑتال کی وجہ سے میرے دورہ کا پروگرام درہم برہم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا لیکن بعد میں اسی ہوائی سروس میں ایسی لیبر بے چینی پیدا ہوئی کہ خود ایسٹرن کے وجود کے لئے ہی خطرہ پیدا ہو گیا میرے امریکہ سے لوٹنے کے بعد آخر کار ایسٹرن کے باس فرانسسکو لارنیزو کے سرمائے دارانہ رویہ کے خلاف اس کے ملازمین نے بھ ہڑتال کر دی۔

1989ء کے 20 مارچ کے نیوز ویک میں لارنیزو کی کارگزاری کی جو تفصیل شا کی گئی وہ سرمائے دارانہ استحصال کی منہ بولتی کہانی ہے۔ ہڑتالی مزدوروں کا کہنا تھا کہ ایسٹرن کو تو چاہتے ہیں لیکن لارنیزو کو نہیں جسے انہوں نے بے رحم اور لالچی قرار ان کے مطابق لارنیزو کا دماغ کسی شیطان کے کارخانہ سے کم نہیں تھا۔

ایسٹرن ایئر لائنز میں حالات بگڑنے کی وجہ لارنیزو کی دھن کی ہوس اس حد جا پہنچی کہ اسے امریکہ میں بدترین باس کے نام سے پکارا جانے لگا کیونکہ اس نے امر قانون کے چیپٹر ۱۱ کے تحت اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کرنے کی کوشش کی۔ حالا اس حد تک پہنچ گئے کہ زیادہ تر مبصرین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یا تو لارنیزو اپنے ترروٹ اپنی سبار ٹینیٹ کانٹی نینٹل ایئر لائنز کو فروخت کر دے یا پھر ان تجارتی حریف کو جنہوں نے انہی دنوں "ایسٹرن" کی تجارتی سرگرمیوں میں ٹانگ اڑانی شروع کر تھی۔ یہاں تک کہ ایک مشہور ہوائی سروس ٹی ڈبلیو اے کے منتظمین نے لارنیز تمام ہوائی سروس کے لئے اس سے بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔

اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے لارنیزو نے کہا تھا کہ وہ ایسٹرن کو چالو رکھنا چاہتا ہے۔ بھلے ہی یہ بہت چھوٹی کمپنی بن کر کیوں نہ رہ جائے لیکن ایسٹرن میں ہڑتال سے اس کے تئیں عوام کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا۔ اس کے ہوائی جہازوں کی بار بار رد ہونے والی پروازوں سے عوام کا اس میں باقی بچا ہوا اعتماد بھی اٹھ گیا امریکیوں کو لارنیزو کے بارے میں اگر کچھ معلوم تھا تو وہ بس اتنا ہی کہ وہ ایک ایسا اجارات مند صنعتکار ہے۔ جس نے جہازرانی کے اصولوں میں "ڈی ریگولیشن" کئے جانے کا فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ جہازرانی صنعت کی سب سے بڑی ہستی کے روپ میں جانا جانے لگا تھا اور ۱۸ برس کی مدت میں اس نے امریکہ کی ہوائی سروسز پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ پہلے اس نے ایسٹرن ایئر لائنز پر قبضہ کیا پھر کانٹی نینٹل پر اس کے بعد "پیپلز ایکسپریس" پر اور اس کے بعد اپنی سرپرست کمپنی "ٹیکساس ایئر" کو دنیا کی سب سے بڑی ہوائی سروسز کو کنٹرول کرنے والی میں تبدیل کر دیا۔ اس عمل میں اس نے بار بار یونینوں اور انڈسٹری کے قانونی اور اصولی بندھنوں کی دھجیاں اڑائیں اور "یونین توڑ" کے روپ میں مشہور ہو گیا۔

لارنیزو کو جاننے والے لوگ اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے ہیں۔ اس کی پرائیویٹ زندگی لوگوں کو بہت کم ہی دیکھنے کو ملی ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں کو جو کچھ معلوم ہے وہ بس اتنا ہی کہ لارنیزو ایک بے حد پرائیویٹ قسم کا آدمی ہے اور اس کی سنک کا حال یہ تھا کہ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ اس سے انٹرویو کرنے آیا اخبار نویس اپنے سوالات کا مرکز اس کی کمپنی کو نہ بنا کر اس کو بنانے والا ہے تو وہ اپنا انٹرویو اس اخبار نویس کے ساتھ عین آخری وقت پر بھی رد کر دیا کرتا تھا۔

جب نیوز ویک کے نامہ نگار نے اس سے پوچھا کہ اس پر کئے جانے والے ذاتی حملوں کا اس کی زندگی پر کیا اثر ہوا ہے تو اس نے بے حد سیدھے سادھے ڈھنگ سے

جواب دیا کہ "میں نے اور میرے خاندان نے اسے پسند نہیں کیا۔" اب تک اس کے بارے میں اس کے شعبہ عوامی رابطہ نے صرف اسی طرح کے حقائق جاری کئے ہیں جن میں اسے بے حد متحرک، عام ہستی دوڑ لگانے۔ اچھی صحت اور لذیذ کھانے کے رسیا کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کا اس کے ساتھ لمبے عرصہ سے ساتھ ہے وہ اس بات سے متفق ہیں کہ اپنے نجی لین دین میں وہ بے حد فراخدل رحم دل اور عقیدت کا کردار تھا جب کہ دوسرے لوگ اسے سنکی اور زہین شخص تسلیم کرتے تھے۔ ایک ایسا شخص جو اپنے کام میں تو بہت محنت کرتا تھا لیکن سوشل سیمیناروں وغیرہ میں لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ کھلتا نہیں تھا۔

O

بے شک لارنیز و لوگوں کے درمیان رہنے میں اپنے آپ کو آرام میں محسوس نہیں کرتا تھا لیکن طیاروں کے آس پاس رہنے میں اسے ہمیشہ خوشی محسوس ہوتی نیویارک میں اپنے بچپن میں وہ جہاں رہتا تھا اس کا وہ گھر لوگاڈیا ہوائی اڈہ کے نزدیک تھا جہاں اسے طیاروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے کا کافی موقع ملا کرتا تھا۔ ہار بزنس سکول سے گریجویٹ کی ڈگری لینے کے بعد اس نے ایک ہوائی سروس اقتصادی تجزیہ نگار کی نوکری کرلی اور اس کے بعد ایک جہاز رانی صلاحکار کمپنی قبضہ جمالیا اور پھر اس کی بلند خواہشات اتنی بڑھیں کہ اس نے اپنے لئے کچھ ہوائی خریدنے کا فیصلہ کرلیا اور آج وہ اتنی بڑی ایئر لائن کا مالک تھا۔

امریکہ میں کسی کروڑ پتی ارب پتی کے متعلق یہ سوچنا کہ یہ ہمیشہ امیر رہے عجب سالگتا ہے۔ اس کی بہترین مثال پیٹر ٹرمپ ہے۔

پیٹر ٹرمپ اٹلانٹک سٹی میں امریکہ کے سب سے مہنگے جوا خانے "تاج م مالک ہے۔ وہ بلاشبہ امریکہ میں جوا خانوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ رئیل سٹیٹ ک

کاروبار نقطہ عروج کو چھو رہا تھا لیکن 1991ء کے آغاز میں وہ بھی گردش حالات کا اس بری طرح شکار ہوا کہ "بنک کرپٹ" ہوگیا۔

1990ء کے آخری مہینے امریکہ میں ریل سٹیٹ کا کاروبار کرنے والوں کے لئے تباہی اور بربادی کے مہینے تھے وہ لوگ جو کروڑوں میں کھیلتے تھے کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگئے۔

ایسا کیوں ہوا؟

اس کے پس پردہ امریکی سیاست کا وہ گھناؤنا کردار ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی محض حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اچانک امریکی ماہرین معاشیات نے ایسی پالیسیاں بنائیں کہ عوامی سرمایہ دھڑا دھڑ عوام سے حکومت کو منتقل ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بڑے بزنس مین بنکوں کے مقروض ہوگئے۔

O

آیئے آپ کو کیلے فورنیا کے دارالحکومت سیکرامنٹو لئے چلیں---!!

کچھ تعارف کرواتا چلوں۔ سیکرامنٹو کی تاریخ 150 سال پرانی ہے--- لیکن امریکہ کے ان دس شہروں میں شامل ہے جس کی آبادی برق رفتاری سے بڑھی یعنی جہاں لوگ بہت تیزی سے آباد ہوئے۔ آبادی بڑھنے سے کوئی اور مطلب نہ لیجئے۔ یہ شرف دنیا میں صرف ہمیں ہی حاصل ہے امریکہ میں شاید دنیا میں سب سے زیادہ تیز رفتاری سے آباد کاری بڑھتی ہے اور ہمارے ہاں آبادی----!!

1839ء میں سوئٹزر لینڈ کے ایک صاحب جان آگٹس شوئر یہاں امریکن دریا کے کنارے اترے اور جانے کیا موج سمائی من میں کہ پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

تب یہ میکسیکو کا علاقہ تھا اور گورنر الوریڈو نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان آگٹس صاحب کو 48000 ایکڑ رقبہ بھی عنایت فرمادیا یہ بالکل ایسی ہی عنایت

تھی جیسی انگریز بہادر کبھی اپنے غلاموں کے ساتھ کیا کرتا تھا---کہ صاحب بہادر کو اگر کسی غلام کی کوئی ادا پسند آئی تو اسے کہہ دیا کہ بھگالو خالی زمین پر گھوڑا---اور جتنا گھوڑا اس نے بھگایا ایک مخصوص وقت تک وہ زمین پھر اس کی ہو گئی۔

اب یہ الگ بات کہ بعد میں یہ غلام جب آزاد ہوئے تو ہمارے بدیسی آقاؤں کی طرح "دیسی آقا" بن کر ہماری گردنوں پر اس بری طرح مسلط ہوئے کہ آج تک مسلط ہیں اور اترنے کا نام نہیں لیتے۔

لیکن---

سیکرامنٹو میں ایسا نہیں---

امریکن آزاد قوم کے باشندے ہیں اور یہی ان کا طرہ امتیاز ہے کہ وہ خود کو غلام نہیں سمجھتے۔

جان آگٹس نے جس وادی میں قیام کیا اس کا نام "نیو ہیلویٹیا" رکھا جو بعد میں یورپی آباد کاروں کی جنت بنا---اور یہاں سے پھر یورپ کے ساتھ تجارتی او معاشرتی رابطے بھی استوار ہونے لگے۔

اپنی رہائش کے لئے جان آگٹس نے یہاں ایک چھوٹا سا مکان بنایا ہوگا جو بعد میں قلعے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ قلعہ ایک طرح سے نوواردوں کے لئے ری سپشن کا کا دیتا رہا۔

1848ء میں سیکرامنٹو کا یہ علاقہ امریکہ کا حصہ بن گیا۔ جان نے یہاں لکڑی مصنوعات تیار کرنے کی مل قائم کر لی تھی جہاں پر تلاش روزگار کے لئے لوگ آ لگے۔ ایک روز اسی مل کے ایک ملازم نے مل سے ملحقہ دریا سیکرامنٹو کے [illegible] چمکدار شے دیکھی اور اس کو اٹھا لایا۔

یہ سونا تھا---!

بس پھر کیا تھا سونے کی تلاش میں یورپ کے کونے کونے سے مہم جو دھڑا دھڑ آتے چلے آئے سونے کی پہلی کان کا مالک جان خود قرار پایا پھر اس کے بیٹے نے زمام اقتدار سنبھالی اور ایک نیا شہر "سیکرامنٹو" کے نام سے آباد کیا۔

1850ء میں اس شہر کو کیلے فورنیا کی یونین میں شامل کر لیا گیا۔

1854ء میں سیکرامنٹو کو کیلے فورنیا کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

موسم سازگار، سونا اور جنگلات کے حسن نے سیکرامنٹو کو یورپی آباد کاروں کا مرکز نگاہ بنا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں جدید بستیاں آباد ہونے لگیں۔

سیکرامنٹو کی شہرت اس کے درخت ہیں۔ جو سڑکوں کے کنارے قطار اندر قطار کھڑے ہیں خوبصورت ہوٹل، وکٹورین طرز تعمیر کے حامل خوبصورت مکانات اور دریائے کنارے خوبصورت مناظر اور بھرپور زندگی کی تمام تر لذتوں کی حامل عارضی رہائش گاہیں اور سب سے بڑھ کر سیکرامنٹو کا اولڈ سٹی۔

سیکرامنٹو میں مغربی امریکہ کا پہلا آرٹ میوزیم اور کیلے فورنیا کا پہلا تھیٹر قائم ہوا---اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں پہلی مرتبہ ڈاک کا باقاعدہ نظام قائم ہوا اور ریل کا "ٹرانس کونٹی نٹل" سسٹم بھی یہیں وجود پذیر ہوا۔

27ویں سٹریٹ اور ایل سٹریٹ کے درمیان جان آگٹس شوٹز کا وہ تاریخی قلعہ موجود ہے جو شہر کے پہلے آباد کار نے قائم کیا تھا اسے اب ریاست کے ایک تاریخی [illegible]اک کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

اس سے ملحقہ سٹیٹ انڈین میوزیم موجود ہے جہاں قدیم آرٹ کے شاہکار محفوظ [illegible] گئے ہیں۔ اس میوزیم میں آپ کو قدیم آباد کاروں کے کلچر، رسوم و رواج اور [illegible]ے کا علم ہو جاتا ہے اور ایک بات جو خاص طور پر حیران کرتی ہے وہ اس دور کے

یورپی آباد کاروں کا ترقی یافتہ شعور تھا۔

ان لوگوں نے زندگی کی ابتدا ہی منصوبہ بندی سے کی تھی اور اسل ٹپ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ مثلاً اگر مکانات بناتے تھے تو ایک ترتیب کے ساتھ خصوصاً سیوریج کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر۔

میدانی علاقوں کا طرز معاشرت اور طرز تعمیر، پہاڑی علاقوں سے قدرے مختلف نظر آتا ہے یہ منصوبہ بندی کا شعور ہی تھا جس نے آج امریکہ کو دنیا کی واحد سپر طاقت بنا رکھا ہے----

اور یہ منصوبہ بندی کا فقدان ہے جس نے ہمیں تحت الثریٰ کی گہرائیاں میں پہنچادیا ہے اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

سیکرامنٹو میں کیلیے فورنیا کے مرکزی دفاتر کی عمارت کی شناخت کے لئے جو گنبد نما عمارت بنائی گئی ہے وہ واشنگٹن ڈی سی سے بالکل ملتی جلتی ہے۔

210 فٹ بلند گنبد کی تین منزلیں نمایاں دکھائی دیتی ہیں جو بالکل واشنگٹن ڈی سی کے گنبد کی مماثل دکھائی دیتا ہے۔

اس عمارت میں سیاحوں کے لئے سات تاریخی عجائب گھر موجود ہیں جہاں روز ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے اور جاتے ہیں----

سیکرامنٹو کیلیے فورنیا کا دارالحکومت ہے میرا خیال تھا کہ یہ چھوٹا سا شہر ہوگا۔ یہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو بہت بڑا شہر ہے۔ آبادی دس لاکھ سے اوپر تجاوز کر چکی ہے۔ شہر میں دو دریا۔ امریکن ریور اور سیکرامنٹو ریور۔ آکر ملتے ہیں۔ شہر میں دریائی بندرگاہ بھی ہے اور چاروں اطراف سے پہاڑیوں میں گھری ہوئی وادی (سیکرامنٹو وادی) میں واقع ہے۔ اس شہر میں درختوں کی بہتات ہے۔ میں نے اتنے درخت کبھی کسی شہر میں نہیں دیکھے۔ پانچویں یا چھٹی منزل پر پہنچ کر نیچے نگاہ دوڑائیں، چاروں اطراف یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کسی جنگل کا نظارہ کر رہے ہیں۔ عمارتیں بھی ان درختوں میں چھپی ہوئی نظر آتی ہیں۔

سیکرامنٹو وادی میں پاکستانی مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد آباد ہے۔ شہروں میں بھی لوگ آباد ہیں اور دیہاتوں میں بھی۔ بعض کے اپنے زرعی فارم ہیں۔ بھٹو حکومت کے ایک وزیر خزانہ حنیف خان کے خاندان کی زمینیں بھی یہاں ہیں۔ وہ خود تو اپنا حصہ فروخت کر گئے تھے لیکن ان کے متعدد رشتے دار اب تک یہیں آباد ہیں۔

سیکرامنٹو میں دو مساجد ہیں، ایک سعودی عرب کے سرمائے سے تعمیر ہوئی اور اس کا انتظام وانصرام عربوں کے ہاتھ میں ہے اور دوسری پاکستانی آباد کاروں نے۔ یہ مسجد قومی شاہراہ نمبر 80 کے بالکل قریب ففتھ سٹریٹ پر واقع ہے۔ خاصی بڑی مسجد ہے۔ ایک ہزار کے قریب نمازی ہال میں نماز ادا کرسکتے ہیں۔ نیچے بیس منٹ ہے۔ یہ

سماجی تقریبات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے مسجد تعمیر کی، انہوں نے اور ان کی بعد میں آنے والی نسل نے ایک کام یہ کیا کہ مسجد کے اخراجات پورے کرنے کے لئے متعدد اپارٹمنٹس تعمیر کرائے اور کرائے پر چڑھا دیئے۔ ان اپارٹمنٹس کو اگرچہ نسبتاً سستے کرائے پر دیا جاتا ہے۔ پھر بھی سالانہ یافت ایک لاکھ ڈالر تک پہنچ جاتی ہے۔ عام طور پر اقلیتیں آپس میں متحد ہو کر رہتی ہیں لیکن برصغیر کے مسلمان انوکھی مخلوق ہیں، جہاں بھی جاتے ہیں مذہب یا سیاست کے نام یا محض اللہ واسطے آپس میں سر پھٹول ہوتے رہتے ہیں اور مقامی حکام کو ان کی مساجد پر تالے ڈالنا پڑتے ہیں۔ سیکرامنٹو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں لیکن یہاں جھگڑا مذہبی بنیاد پر نہیں (امام مسجد دہلی سے آئے تھے اور اختلافی بات کم ہی کرتے ہیں۔ پہلے اردو میں تقریر کرتے ہیں، پھ اس کا خلاصہ انگریزی میں پیش کرتے ہیں) بلکہ دو پارٹیوں کے مابین وجہ نزع وہی ایک لاکھ سالانہ ڈالر کی آمدنی بتائی جاتی ہے۔ دونوں پارٹیاں نماز اکٹھے پڑھتی ہیں لیکن مسا میں جو سماجی تقریبات منعقد ہوتی ہیں ان میں ایک دوسرے کا بائیکاٹ کرتی رہتی ہیں جو گروپ برسر اقتدار آجاتا ہے دوسرا اس کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف جاتا ہے اور مسجد پر قبضہ کرنے کی تراکیب سوچتا رہتا ہے۔

ایک روز بال کٹوانے گیا۔ جس دکان میں داخل ہوا وہاں دو نوجوان لڑکیاں تھیں ایک کسی نوجوان لڑکے کے بال کاٹ رہی تھی اور دوسری فرش پر پڑے بالوں کی صف کرنے کے لئے جھاڑو دینے میں مصروف تھی۔

لڑکیاں دیکھ کر کچھ گھبراہٹ ہوئی، پھر دل کڑا کر کے بیٹھ گیا۔ جو لڑکی بال اٹھا میں مصروف تھی وہ میری طرف آئی اور ایک رجسٹر کی طرف اشارہ کیا۔ رجسٹر پر اپ لکھا اور آمد کا وقت۔ چونکہ رش زیادہ نہیں تھا اس لئے فوراً ہی باری آگئی۔ لڑکی فرش صفائی کر چکی تھی اور اب وہ دوبارہ میرے پاس آئی اور بولی کہ "تیار ہو؟"

کرسی پر بٹھایا۔ اپنا فرسٹ نام کرس بتایا اور مجھ سے میرا فرسٹ نام پوچھا۔ اب ں کون سمجھائے کہ ہمارے ہاں فرسٹ اور لاسٹ ناموں کا کوئی تصور نہیں۔ ہر ں کا اپنا نام ہے اور عزیز، دوست اور اجنبی سب اسی نام سے مخاطب کرتے ہیں لیکن مغرب کو یہ سمجھانا خاصا مشکل ہے۔ بہر حال اسے نام کا ایک حصہ بتایا۔ عام حجاموں طرح کرس بھی باتونی لڑکی تھی، زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی رکنے کا نام ہی ں لیتی۔ میں نے پوچھا۔ "یہیں ڈیوس میں رہتی ہو؟"

"نہیں، وڈلینڈ سے آتی ہوں"

"وڈلینڈ سے؟ خاصا دور ہے۔"

"دور؟ آپ سے کس نے کہہ دیا؟ دس میل ہی تو ہے۔ اپنی کار میں آتی ہوں اور ف پندرہ منٹ میں پہنچ جاتی ہوں"

"خاصی تیز ڈرائیونگ کرتی ہوں گی؟" (کیلی فورنیا میں رفتار پر سخت پابندیاں ا۔ شہر میں بیس میل سے اور فری وے پر 55 میل سے اوپر گاڑی نہیں چلا سکتے ے گئے تو پھر بھاری جرمانہ ادا کئے بغیر جان نہیں چھوٹتی)

"ہاں۔ چونکہ وڈلینڈ اور ڈویس کو فری وے ملاتی ہے۔ اس لئے زیادہ دقت پیش آتی۔"

"ملازم ہو یا اپنی دکان؟"

"اپنی دکان؟ صاحب، کیوں مذاق کرتے ہو۔ یہاں دکانیں سرمایہ داروں کی ہیں۔ ے نہیں۔ کئی کئی کے مالک ہوتے ہیں۔ عام لوگ ان پر کام کرتے ہیں۔ تاہم لک بہت بھلا آدمی ہے۔ کبھی تنگ نہیں کرتا" وہ رکی پھر پوچھا۔

"آپ پہلے کبھی یہاں بال ترشوانے آئے تھے؟"

"شاید۔ میں امریکی نہیں ہوں۔ پاکستان سے آیا ہوں یہ کبھی نام سنا ہے؟"

"بالکل۔ ہمارے شہر میں کئی پاکستانی آباد ہیں"

بال کٹ گئے۔ معاوضہ نو ڈالر لکھا تھا۔ شاید کچھ رعایت بھی تھی۔ میں نے دس
ڈالر کا نوٹ تھمایا۔ رسید کاٹی اور مجھے بقایا واپس کر دیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے
منع کر دیا۔ ان امریکیوں کو ٹپ دینے میں مزا آتا ہے۔

ڈیوس میں بھی ایک مسجد ہے۔ چند سال قبل کوئی سعودی شہزادہ یہاں
تھا، مسلم طلبا نے بتایا کہ مسجد نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بہت دقت پیش آتی ہے
شہزادے کی تحریک پر شہر کی ایک مین روڈ برسل بلے وارڈ پر ایک مکان خریدا گیا
مقامی کونسل کی منظوری سے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔

شہر میں آباد مسلمانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے لیکن طالب علم خا
تعداد میں آتے رہتے ہیں۔ امریکی امداد کی بندش کے بعد پاکستانی طلبا کی تعداد ہر س
گھٹتی جا رہی ہے لیکن عرب طلبا کی آمد ہنوز جاری ہے اور مسجد کا انتظام بھی زیادہ تر ا
کے ہاتھ میں ہے۔ یہ طلبا باری باری اپنے میں سے کسی کو امام منتخب کر لیتے ہیں۔ پ
سال امام ایک پاکستانی پختون طالب علم تھا، وہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد واپس گ
ایک عرب طالب علم امام بن گیا لیکن جمعہ کا خطبہ مختلف طلبا باری باری پڑھتے ہیں۔

مسجد میں ہر مکتب فکر کے لوگ نماز ادا کرنے آتے ہیں۔ تقریباً تمام کے تما
عرب آمین کہتے ہیں لیکن برصغیر کے لوگ زیادہ تر آہستہ۔ کوئی کسی پر معترض نہیں
ہوتا۔ جمعہ کے روز خوب رونق ہوتی ہے۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی، دیار غیر میں
ہر کسی کو اپنی شناخت کا احساس ہوتا ہے۔ نمازیوں میں مقامی سیاہ فام اور دو تین سفید فا
مسلمان بھی شامل ہوتے ہیں۔

شام کو ڈاکٹر امتیاز نے دعوت کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر امتیاز 1979ء میں پی ایچ ڈ
کرنے ساہیوال سے آئے تھے۔ ڈیوس کی آب و ہوا اتنی پسند آئی کہ یہیں کے

رہے۔ اب کام کرنے روزانہ برکلے جاتے ہیں لیکن رہتے ڈیوس میں ہیں۔ بہت بھلے
آدمی ہیں اور اصولوں کے بہت پابند۔ چاہتے تو کبھی کا مکان خرید لیتے۔ (امریکہ اور
برطانیہ میں مکان خریدنا مشکل کام نہیں۔ صرف پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس فیصد رقم کا
انتظام کریں۔ بقیہ بنک قرض دے دیں گے، کرائے سے کچھ ہی زیادہ قسط بنتی ہے)
ڈاکٹر صاحب نے تہیہ کر رکھا ہے کہ نہ سود لیں گے اور نہ دیں گے مکان خریدیں تو
کیسے؟ ابھی تک کرائے کے مکان میں پڑے ہیں۔

اگلے روز شام کے وقت یونیورسٹی لائبریری گیا۔ بہت بڑی لائبریری ہے۔ کہا
جاتا کہ اس میں بائیس لاکھ کتب ہیں اور ہر سال ایک لاکھ کتابوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔
چار منزلہ عمارت کے نیچے "بیس منٹ" ہے۔ "بیس منٹ" میں دنیا بھر کے اخبارات و
رسائل مختلف الماریوں اور میزوں پر سجے رہتے ہیں اور پڑھنے والوں کا ہر وقت ہجوم
رہتا ہے۔ دیگر اخبارات کے علاوہ یہاں "پاکستان ٹائمز" اور جدہ کا "عرب نیوز" بھی
دستیاب ہے۔ اگرچہ یہ اخبارات آٹھ دس دن باسی ہوتے ہیں، پھر بھی وطن کے
حالات معلوم کرنے میں خاصے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

○

امریکنوں نے اگر آج ساری دنیا پر اپنی طاقت اور حکومت کا سکہ جما رکھا ہے۔ تو
اس کا سبب صرف دھونس اور دھاندلی ہی نہیں----

سیاہی ہیرا پھیری پتھر کے زمانے کا انسان بھی کرتا تھا۔ آج کے مہذب انسان
نے "ڈپلومیسی" کا نام دے دیا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امریکن اپنی ڈپلومیسی کے سہارے ساری دنیا کو
سرنگوں کرتے چلے جا رہے ہیں۔

لیکن----

اس دنیا میں وہ قومیں اور ملک بھی موجود ہیں جنہوں نے اپنی ترجیحات کا تعین بہت پہلے کر کے بڑی کامیابی سے اس ڈپلومیسی کو چاروں شانے چت کیا ہے----

کیا امریکہ کی یہ خواہش نہیں رہی کہ وہ یورپ پر بھی بادشاہت کرے؟

لیکن----

دیکھ لیجئے----

یورپین اس کے قابو نہیں آرہے----

امریکن سسٹم میں بے شمار کیڑے نکالے جاسکتے ہیں۔

لیکن----

ان کا ایک کریڈٹ کوئی نہیں چھین سکتا کہ امریکن حکومت اپنے عوام کو اپنا حصہ سمجھتی ہے----پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں سیشن چل رہا ہو تو اس کے دو دو فرلانگ دور تک کسی چڑیا کو پر مارنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

اسمبلی کی طرف آنے والی سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں گورنر بہادر کی سواری گزرنی ہو تو سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں۔

وزیراعظم کی تو بات ہی اور ہے۔ وہاں تو گھنٹوں پہلے خلق خدا کو عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ یہ اس کے برعکس امریکہ میں جب بھی عوام چاہیں اپنے حاکموں کو گردن سے پکڑ سکتے ہیں---- جس کا اگلی نشست میں ذکر کروں گا کہ واشنگٹن ڈی سی میں کانگریس اور سینٹ بلڈنگ میں عوام کس طرح دندناتے پھرتے ہیں۔

شاید سی آئی اے یا پینٹاگون ہی دو ایسی عمارات ہوں جہاں سیکورٹی اقدامات کے تحت پابندیاں عائد ہوں ورنہ امریکہ کی کوئی عمارت یا دفتر ایسا نہیں جو "شاہراہ عام" نہ ہو----

سیکرامنٹو کی اس عمارت میں بھی لوگ آسانی سے آجا سکتے ہیں۔

افسوس۔ صد افسوس کہ ہم پیروکار تو ان کے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو فاروق اعظمؓ تھے۔

جن کو بھرے مجمع میں مسلمان تقریر کرنے سے روک کر ان کے تن پر موجود کپڑوں کا حساب پوچھا کرتے تھے اور اب ہمارے دماغ ایسے بگڑے ہیں کہ اپنی شکلیں تو کیا بگاڑیں اپنے اقتدار سے بھی بغاوت کر دی----

وہ حکمران جو کاسہ گدائی اٹھا کر امریکی ایوانوں میں اقتدار کی بھیک مانگتے ہیں۔ جب مسند اقتدار پر براجمان ہو جائیں تو خود کو فرعون بنا لیتے ہیں۔

کیا انہیں علم نہیں ہوتا کہ ان کے عوام کو کس عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے جب ان کی سواری سڑکوں سے گزرتی ہے؟

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ بات ان کے علم میں نہ رہی ہو---وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں۔ اسی زمین پر چلنے پھرنے والے انسان ہیں۔ اب یہ الگ بات کہ اقتدار کے نشے میں اندھے ہو کر وہ خود کو "فرنگی حکمران" بنالیں۔

28 ایکڑ پر مشتمل "اولڈ سیکرامنٹو" ہی دراصل وہ علاقہ ہے جس کے پانیوں میں بھی سونا تیرا کرتا تھا۔

زندہ قومیں اپنے ورثے کو سرمایہ حیات سمجھ کر نہ صرف محفوظ رکھتی ہیں بلکہ اس کی حفاظت کے لئے بھی ہر ممکن اقدامات کرتی ہیں۔ جس کی بہترین مثال پرانے سیکرامنٹو کی حفاظت ہے۔

28 ایکڑ رقبے پر مشتمل یہ علاقہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا آج سے ۱۵۰ سال پہلے تھا۔

یہاں سیکرامنٹو کا پہلا ریلوے سٹیشن، سینما ہاؤس، تھیٹر، میوزیم، سکول، گھر اور دریا میں قدیم جہازوں میں قائم ہوٹل موجود ہیں۔

کیا مجال جو ان پر آلودگی قدرتی یا غیر قدرتی ---- کسی بھی طرح اثر انداز ہو
سکے۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ "اولڈ سیکرامنٹو" میں جتنی بھی عمارات محفوظ ہیں جن
میں ایک شاپنگ مارکیٹ بھی شامل ہے وہ سب ان ہی اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں جو یہاں
ابتدا میں استعمال ہوتی رہیں۔

یہ سارا شہر دریائے سیکرامنٹو کے کنارے پر موجود ہے----

○

یہاں آنے والے سیاح اس حصے کی کشادہ گلیاں، سڑکوں پر بنے سائیڈ ورک، اور
دریا کے کنارے پر بنی بستی کو دیکھ کر خود کو 19ویں صدی کا باشندہ محسوس کرتے ہیں۔

اس کے لئے سو بلڈنگیں محفوظ کی گئی ہیں جن میں ایک کمرے کا وہ سکول بھی
شامل ہے جو سیکرامنٹو کا پہلا سکول تھا۔

اس سکول میں جب بھی آپ جائیں کوئی نہ کوئی کلاس چل رہی ہوتی ہے۔

مجھے بھی اس کلاس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔

کلاس روم میں ایک ڈھلتی عمر کی خاتون استانی جس نے مقامی لوگوں کا قدیم لباس
پہن رکھا تھا وہاں آنے والوں کو سیکرامنٹو کے اس سکول کی تاریخ بتا رہی تھی۔

اس درمیان آپ کو سوالات کرنے کی اجازت ہے۔

بالکل کلاس روم والا ماحول موجود ہے جیسے کوئی استاد اپنے شاگردوں کو پڑھا رہا ہو
اسی طرح پہلا پوسٹ آفس اور پہلا امتحانی کمرہ بھی جوں کا توں موجود ہے۔

ان کے علاوہ اس شہر بے مثال میں اس دور کے مکانات، ہوٹل، کافی ہاؤس، آئس
کریم پارلر، بوتیک اور گفٹ شاپس بھی موجود ہیں۔

ان میں سامان زندگی تو نیا ہے لیکن عمارات پرانی ہیں اور ان کی بقا کا راز بھی شاید
اسی میں ہے کہ یہ پرانی عمارات چونکہ زیر استعمال ہیں اس لئے ان کی آرائش و زیبائش

قرار رہتی ہے۔

اس تجربے سے ہمارے آثار قدیمہ کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہم تو خدا کے فضل سے
انی عمارات کو یہ جان کر آثار قدیمہ بناتے ہیں کہ ایک روز یہ خود ہی تباہ ہو کر نیست و
ید ہو جائیں گی اور ہماری جان چھوٹے گی----

آپ لاہور کے شاہی قلعہ میں جائیں وہاں زیر زمین سرنگ کو بند کر دیا گیا ہے--
ں نے متعلقہ اتھارٹیز سے ان کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے گوہر فشانی فرمائی۔

ایسا ان تاریخی عمارات کی حفاظت کیلئے کیا گیا ہے۔

بے اختیار سر پیٹ لینے کو جی چاہا کہ عالی جاہ! جب ان کی صفائی نہیں ہوگی ہوا کی
مدورفت کے راستے نہیں ہوں گے، مرمت جاری نہیں رہے گی تو یہ عمارات آہستہ
ہستہ تباہ ہو جائیں گی یا محفوظ ہوتی جائیں گی؟

شاید اب ہمارا تاریخی اثاثہ صرف تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہو جائے گا اور ہمارا
لمہ آثار قدیمہ بڑی سرگرمی بلکہ تن من اور دھن سے اس منصوبے پر عمل پیرا ہے۔

ع اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

1849ء میں تعمیر ہونے والا اولڈ ریگل تھیٹر جو یہاں موجود ہے کیلے فورنیا کا قدیم
ین تھیٹر ہے جہاں آج بھی روزانہ ڈرامے، تماثیل اور پروگرام دکھائے جاتے ہیں اور
ائقین کے لئے 1849ء کا ماحول پیدا کر کے انہیں آج کا ڈرامہ دکھایا جا رہا ہے۔

1876ء میں قائم ہونے والا سنٹرل پیسیفک پیسنجر سٹیشن جوں کا توں اپنی جگہ کھڑا
ہے اور یہاں وہ ٹرینیں بھی موجود ہیں جو تب چلائی جاتی تھیں اور آج تک چلائی جا رہی
یں انہیں امریکی اپنی زبان میں پسنجر کار کہتے ہیں۔

اس حصے میں کیلے فورنیا سٹیٹ ریل روڈ میوزیم بھی موجود ہے----!

یہاں 21 قدیم ترین ریلوے انجن اور بوگیاں مکمل اور محفوظ حالت میں موجود

ہیں اور اس لحاظ سے شاید دنیا کا یہ سب سے بڑا ریل میوزیم شمار ہوگا۔

سٹیم انجنوں کے 4294 نمونے یہاں موجود ہیں جو کروڑوں ڈالر مالیت کے ہیں
اور شاید ہزاروں ڈالر سالانہ ان پر خرچ بھی اٹھتا ہے۔

یہاں کیلیے فورنیا کی قدیم ترین ریل لیوسین بیبز Lucivs Beebs
1882ء میں تیار ہونے والی "گولڈ کوسٹ" گورنر سلفر ڈٹرینیں موجود ہیں---وا
دنیا میں ان ہی قوموں کا مستقبل روشن ہے جنہوں نے اپنا ماضی محفوظ رکھا۔
یادرکھا۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی کی حفاظت بھی کی----!

سرخ نانک چندی اینٹوں کی 1854ء میں بنی بلڈنگ میں سیکرامنٹو سٹی ہال قائم
جہاں واٹرورکس کے دفاتر ہیں۔ یہاں ویڈیو پر ہر وقت مختلف تاریخی فلمیں چلتی ر
ہیں جنہیں دیکھنے سے آپ کو سب کچھ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

اس سٹی ہال کی ایک خصوصیت ناقابل فراموش ہے کہ آپ جب بھی چاہیں
کی فلاح و بہبود یا مزید بہتری کے لئے ہونے والی کسی بھی بحث میں حصہ لیں---
اپنی تجاویز پیش کریں----اور اپنے نیک مشوروں سے نوازیں۔

مزید حیرت کہ یہ سب کچھ کرنے پر آپ کا شکریہ ادا کیا جائے گا اور باقاعدہ لکھ
تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے----

○

اب اندازہ فرمایئے کہ اگر خدانخواستہ کبھی آپ کا دماغ خراب ہو اور آپ اپنے
کی کارپوریشن کو کوئی مشورہ دینا چاہیں تو آپ کا کیا حشر کر دیا جائے گا۔ اور کچھ نہیں
از کم آپ کو یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ آپ سے زیادہ احمق اور بے وقوف شخص
شہر میں کوئی نہیں کہ جو اپنی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کو مشورہ دینے چلا ہے۔

1850ء میں چونکہ یہاں سونا تلاش کرنے کی انڈسٹری عروج پر تھی۔ اس زمانے
کی بنی "پیڈل بوٹس" دریا میں مستقل لنگر انداز ہیں اور "ڈیلٹا کنگ" نامی ایک بڑا جہاز بھی
جس میں اب ریسٹورینٹ بنادیا گیا ہے محفوظ و مامون کھڑا دعوت نظارہ دے رہا ہے۔

پیڈل سے چلنے والی کئی کشتیاں مثلاً "ریور سٹی کوئین" ایلزبتھ لوئیس وغیرہ آپ کی
طفن طبع کے لئے آج بھی موجود ہیں۔

اب آپ کو شاید دریا میں سونا نہ مل سکے کہ سارا سونا امریکیوں نے نکال لیا ہے۔

پرانے سیکرامنٹو سے تھوڑے فاصلے پر پندرہ کمروں پر مشتمل "وکٹورین گورنر
مشن" بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ جہاں کیلیے فورنیا کے 13 گورنر اپنی مسند اقتدار سجا چکے
ہیں ان میں امریکہ کے سابق صدر جناب رونلڈ ریگن کا نام بھی شامل ہے---
موصوف بھی یہاں گورنر رہ چکے ہیں---

اب یہ گورنر ہاؤس "سٹیٹ میوزیم" بن چکا ہے جہاں آپ کو 19 ویں صدی کی
اس عظیم الشان عمارت میں اس زمانے کا طرز تعمیر اور طرز معاشرت مکمل زندگی کے
ساتھ موجود دکھائی پڑے گا۔

1973ء میں قائم ہونے والا مغربی امریکہ کا قدیم ترین آرٹ میوزیم کروکر آرٹ
میوزیم بھی یہاں موجود ہے یہاں موجود یورپین پینٹنگز کے نمونے اور بڑے بڑے
آرٹسٹوں کی نایاب ڈرائینگز جن کا تعلق 19 ویں صدی سے تھا اس میوزیم کا امتیاز ہیں۔

اس سے آگے چلئے تو فرنٹ سٹریٹ پر "ٹووی فورڈ میوزیم" Towe ford ہے
اس میوزیم کی انفرادیت یہ ہے کہ 1903ء سے 1953ء تک فورڈ کمپنی کی تیار کردہ
کاروں کے تمام ماڈل یہاں محفوظ ہیں۔

17 ویں سی سٹریٹ پر "الماؤنڈ گروراکیسچینج" نامی فیکٹری ہے جہاں دنیا کا سب سے
بڑا بادام صاف کرنے کا کارخانہ لگایا گیا ہے----

ہم جب امریکہ میں گئے تھے تو اپنے ملک میں ملنے والے باداموں کو ہی دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ امریکہ جا کر احساس ہوا کہ ہم تو باداموں کے نام پر کچھ اور ہی کھاتے رہے ہیں اصل میں بادام تو یہ ہیں --- بلا مبالغہ ہمارے تین باداموں کے سائز کا ایک بادام اور سارے میٹھے ----!

امریکہ میں کڑوا بادام کم از کم میں نے نہیں کھایا---!

اس پلانٹ میں آپ کو دنیا کی پانچ زبانوں میں بنی ایک فلم دکھائی جاتی ہے جس میں امریکہ میں بادام کی صنعت کا تفصیلی جائزہ۔ بادام کی کاشت سے تیاری تک کے مراحل پر بنی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

○

سیکرامنٹو کی ایک یادگار تقریب یہاں کا سالانہ بینڈ مظاہرہ ہوتا ہے جسے مقامی لوگ Sacrament Dixieland Jazz Jubliee کہتے ہیں۔ اس "بینڈ میلے" میں دنیا کے کونے کونے سے سو بہترین بینڈ حصے لیتے ہیں۔ اور آپ اندازہ کیجئے کہ جب سو مختلف بینڈ اپنی اپنی دھنیں باری باری سنائیں اور بینڈ بھی وہ جو ساری دنیا میں انتخاب ہوں تو وہاں کیا سماں بندھتا ہوگا----

یہ واقعی ناقابل فراموش تجربہ ہے۔

شاید دنیا میں اس سے بڑا بینڈ میلہ اور کہیں نہیں لگتا۔

دریائے سیکرامنٹو اور دریائے امریکہ سینکڑوں میل لمبے دریا ہیں۔ جن میں جگہ جگہ آپ کو تیرنے، ماہی گیری کرنے اور واٹر سپورٹس کے مواقع میسر آتے ہیں ان کاموں کے لئے یہاں خاص پوائنٹ بھی بنائے گئے ہیں----

ان دریاؤں کا پانی کہیں نیلا اور کہیں سفید---اور کہیں کہیں دونوں کا خوبصورت امتزاج----

قدرت نے ہمیں کس نعمت سے نہیں نوازا----

دریا، پہاڑ، سمندر، قدرتی لینڈ سکیپ غرض کون سی ایسی نعمت ہے جو ہمیں حاصل نہیں۔

لیکن----

ہم کس شدت سے کفرانِ نعمت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

ہم نے اپنے دریاؤں، پہاڑوں، سمندر اور قدرتی مناظر کا حسن اپنی بد ذوقی اور بد تہذیبی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

راوی دریا پر جائیے آپ کو سارے لاہور شہر میں شاید ہی راوی کا کوئی ایسا کنارہ ملے جہاں آپ بیٹھ کر دریا کے قدرتی حسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔

جہاں بھی آپ نظر دوڑائیں آپ کو گندگی کے ڈھیر نظر آئیں گے۔

افسوس اب تو لاہور کی ساری گندگی ایک گھناؤنے منصوبے کے تحت دریائے راوی میں پھینکی جا رہی ہے۔

ایک امریکنوں کے دریا ہیں میلوں چلتے چلے جائیے۔ کیا مجال جو کہیں کاغذ کا ایک پرزہ بھی آپ کو دکھائی دے۔

۹۱ء میں جب میں امریکہ گیا تو اٹلانٹک سٹی پر سمندر کے ساحل پر خدا جانے کہاں سے ٹیکے لگانے والی خالی سرنجوں کا ایک پیکٹ پانی میں تیرتا یہاں پہنچ گیا---

یقین جانئے یہ اس روز کے مقامی ٹی وی اور اخبارات کی اہم خبر تھی۔

باقاعدہ تحقیق و تفتیش ہونے لگی کہ اس غفلت مجرمانہ کا مرتکب آخر کون ہوا ہے؟

میں نے خبر کا فالو اَپ نہیں کیا۔

میں جانتا ہوں کہ ان لوگوں نے اس غفلت کو جرم سمجھ کر اس کی تفتیش کی ہوگی اور ملزم کو کبھی معاف نہیں کریں گے-------

○

شاید آپ کو علم نہ ہو کہ امریکہ میں ہائی وے پر ایک بورڈ اکثر آپ کی توجہ اپنی
طرف مبذول کرائے گا جس پر لکھا ہوتا ہے۔ "لیٹرنگ فائن" یعنی دوران سفر سڑک
کے کنارے کچھ پھینکنے کا جرمانہ----

اور آپ جانتے ہیں یہ کم از کم کتنا جرمانہ ہے----200ڈالر----

جی ہاں دو سو ڈالر۔ اگر آپ نے دوران سفر کار سے سگریٹ یا کوئی خالی ٹن یا کو
بھی اور شے باہر پھینکی تو آپ کو راستے کا کوئی نہ کوئی ریڈار چیک کرلے گا اور کسی نہ کر
موڑ پر دھر لئے جائیں گے۔

یہ جرمانہ 400ڈالر تک بھی ہو سکتا ہے اب اسے پاکستانی روپیوں سے ضرب د
کر دیکھ لیجئے کہ کسی کا دماغ اگر خراب نہ ہو گیا ہو تو وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔

○

دریاؤں کے ساحل ان کے پانیوں کی طرح صاف و شفاف رکھے جاتے ہیں۔ خصو
وہ مقامات جہاں عوامی اجتماع ہوتا ہے وہاں اس بات کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

سیکرامنٹو کا چڑیا گھر بھی اپنی نوعیت کا ایک چڑیا گھر ہے۔ امریکہ میں کوئی بھی
چڑیا گھر نہیں جہاں کسی پرندے یا جانور کو غیر قدرتی ماحول میں رکھا جائے۔

یہاں قریباً 700 مختلف اقسام کے جانور ہیں جن کو کھلی فضا میں رکھا جاتا ہے۔

آپ اپنی کار میں بیٹھ کر ان کا نظارہ قریب سے کیجئے---- پیدل بھی چلئے۔
کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ جس ماحول میں بھی کوئی جانور رکھا گیا ہے اس بات
امکانات نظر نہیں آتے کہ وہ آنے والوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکے۔ یوں
ہماری طرح وہ لوگ جانوروں کو زچ نہیں کرتے----
صرف محبت کرتے ہیں----

ہماری محبت کا انداز بھی بڑا جان لیوا ہوتا ہے----

اول تو خدا کے فضل سے ڈھنگ کے چڑیا گھر ہی دو تین سارے پاکستان میں ہوں
گے۔ یہاں بھی جو لوگ جاتے ہیں وہ جانوروں کو چڑانا اپنا فرض منصبی خیال کرتے ہیں
ر جانوروں کو اتنا تنگ کرتے ہیں کہ وہ پنجروں میں بند یا چیخنے چلانے لگیں یا پھر ڈر کر
پنے بل میں واپس چلے جائیں۔

یکرامنٹو کے چڑیا گھر میں جو جانور رکھے گئے ہیں۔ ان میں آبی جانوروں کے لئے باقاعدہ
ئی لینڈ قائم کئے گئے ہیں جبکہ زمینی جانوروں کو ان کا قدرتی ماحول مہیا کیا گیا ہے----
ں پارک میں فیری ٹیل ٹاؤن بھی موجود ہے۔ یہاں بچوں کو کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔
دکھائی جاتی ہیں۔

6ایکڑ پر مشتمل کھیل کا میدان ہے کہ یہاں اپنا شوق پورا کر لیجئے۔

گولف کورس الگ سے بنایا گیا ہے۔

پکنک پوائنٹس، میوزک سے لطف اندوز ہونے کی جگہیں اور اپنی مرضی کے کھیل
یلنے کے مواقع آپ کو یہاں حاصل ہیں۔

شہر کے شمال میں 134 سال پرانی وہ نمائش گاہ ہے جہاں سالانہ نمائش لگتی ہے اور
ریکہ کے لیبر ڈے سے 18 روز قبل شروع ہونے والی یہ نمائش لیبر ڈے پر ختم ہو
اتی ہے۔

○

اسے آپ ہمارا عوامی میلہ اور میلہ اسپاں و مویشیاں سمجھ لیجئے جہاں دور دور سے
سان اپنے صحت مند جانوروں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں----

نیزہ بازی اور گھڑ سواری کے مقابلے، دیہاتی اور شہری کھیلیں منعقد ہوتی ہیں
ریم و جدید کا حسین امتزاج سیکرامنٹو کیلیفورنیا کا ایک یاد رہنے والا شہر ہے۔

امریکہ میں سکھوں کی نمائندگی کرنے والا واحد پرچہ "ورلڈ سکھ نیوز" ہے---
جس کا دفتر کیلیفورنیا کے چھوٹے سے شہر "سٹاکٹن" میں ہے۔ سٹاکٹن کی تاریخی اہمیت
میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ چونکہ میں بھی اس "ہفت روزہ ورلڈ سکھ نیوز" سے گزشتہ 3
سال سے وابستہ ہوں اور یہاں ہفتہ وار کالم لکھتا ہوں اس لئے میری حیثیت ایک سٹاف
ممبر کی سی ہے۔

ڈاکٹر گورندر سنگھ گریوال جو سنٹرل ویلی کے چھوٹے سے ٹاؤن "ٹریسی" میں
پریکٹس کرتے ہیں اس علاقے کے واحد ماہر امراض دل ہیں جنہیں میڈیکل کی زبان
میں "کارڈیک سرجن" کہا جاتا ہے۔

ایک سرجن امریکہ میں کتنا مصروف ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے اسے خود کو مصروف
رکھنا پڑتا ہے اس کا تصور شاید آپ نہ کر سکیں۔ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس
امریکہ میں ڈاکٹروں کو کام کرتے دیکھا ہے۔

حیرت ہے کہ اس کے باوجود ڈاکٹر گریوال اپنے رسالے ڈبلیو ایس نیوز کے ایڈ
بھی ہیں۔

وہ باقاعدگی سے روزانہ ایک گھنٹہ پرچے کے لئے وقف کرتے ہیں اور ٹریسی
سٹاکٹن آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے آتے اور پھر واپس جاتے ہیں۔ دریں اثنا بھی وہ پر
سے "ان ٹچ" رہتے ہیں اور کوئی بھی قباحت پیش آنے کی صورت میں انہیں فوا

کے ان سے مشورہ لیا جاتا ہے۔

اندرجیت سنگھ پرچے کے پنجابی (گورمکھی) حصے کے اور سردار ڈھنڈسا انگریزی
حصے کے انچارج ہیں۔

دونوں نوجوان اور انرجیٹک ہیں۔

اندرجیت نے باقاعدہ صحافت امریکہ میں ہی شروع کی تھی اور اب باقاعدہ صحافی
بن چکے ہیں۔ انہیں امریکہ میں اتنی زیادہ مشینی سہولتیں حاصل ہیں کہ ان کا کام خاصا
آسان ہو جاتا ہے۔

ان مشینوں کو آپریٹ کرنا بھی ایک مسئلہ ہے۔

اندرجیت نے ٹائپ کرنا یہاں سیکھا تھا اور اب انہیں اس پر کمال حاصل ہے۔ دنیا
کے کونے کونے سے دفتر میں جمع ہونے والی خبروں کی "سب اینگ" کرنا ان کی
سرخیاں نکالنا اور ان کی پیسٹنگ کروانا ان کی ذمہ داری ہے جو خاصا مشکل کام ہے، لیکن
امریکہ میں کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔

یہاں آپ یا تو کام کرتے ہیں یا نہیں کرتے----

یہ مشکل آسان والی ٹرمنالوجی یہاں نہیں چلتی۔ امریکہ ہمیں چونکہ مرفی لا
(Myrphy Law) جس کا بنیادی اصول "ہائر اینڈ فائر" ہے اس لئے ورکر اور مالک
دونوں کو اپنی افادیت یاد رہتی ہے۔ میں نے اکثر دفاتر میں ایک پوسٹر چسپاں دیکھا ہے
جس پر لکھا ہوتا ہے۔

اصول نمبر ایک باس از آل ویز رائیٹ (مالک ہمیشہ صحیح ہوتا ہے) اصول نمبر دو،
اف باس از رانگ (اگر مالک غلط ہے) اصول نمبر تین۔ سی اگین رول نمبر ون (پھر آپ
دوبارہ اصول نمبر ایک دیکھیں) یعنی باس اگر غلط بھی ہے تو بھی صحیح ہے---! کیسا
عجیب اور بسا اوقات پریشان کر دینے والا اصول ہے پہلے پہل تو امریکہ میں آ کر انسان

حیران ہی رہ جاتا ہے کہ ایسے آزاد اور جمہوری معاشرے میں مزدوروں کے حقوق کیا
ہیں؟ مالک کے کیا ہیں؟

ہمارے پاس تو ذرا جمہوریت آئے اور تالا بندی کا حق ملے تو آدھے ملک کی
فیکٹریوں کو تالے لگ جاتے ہیں۔ کم از کم یونین سازی کو آئینی حیثیت تو یہاں حاصل
ہے لیکن امریکہ میں ایسا نہیں۔

امریکہ میں مزدور یونینز ضرور ہیں لیکن مالکوں کو کسی بھی ملازم کو کوئی وجہ بتائے
بغیر نوٹس دیئے بغیر کان سے پکڑ کر نکال دینے کا حق بھی حاصل ہے اور اس سلسلے میں
یونین مالکان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

یونین زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے جو مراعات
ملازمین کو حاصل ہیں انہیں یقینی بنائے۔

○

ڈھنڈسا آج کل ڈبلیو ایس نیوز کے انگریزی سیکشن کا انچارج ہے اس سے پہلے
بھارت میں تین چار انگریزی اخبارات میں کام کر چکا ہے۔ بلا کا محنتی اور ذہین نوجوان۔
اس پرچے میں کام کرنے کا مطلب تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔

کیونکہ یہ پرچہ خالصتان نواز سکھوں کا نمائندہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے اور امریکہ
میں ایک ہی ایسا پرچہ ہے جو بھارتی حکومت کی اچھی طرح خبر لیتا ہے اس لئے بھارتی
حکومت کی اس پر خاص نظر ہوتی ہے۔

یہاں ایک اور بات میں گوش گزار کرتا چلوں کہ بھارتی حکومت کے بیرون ملک
سفارتخانوں کو اپنے ملک جیسا نہ سمجھ لیجئے۔

ہمارے سفارتکار چونکہ خود کو "رومن دور" کے ایلچی سمجھتے ہیں اس لئے اسی ٹھاٹ
باٹ سے رہتے ہیں۔

پاکستان سے باہر ہمارے سفارتکاروں کا (چند مثالی شخصیتوں کو نکال کر) صرف
کام ہے کہ اپنے ملک کے غریب الوطن لوگوں کو آپنے ہونے کا احساس دلاتے
ں----

معمولی کاموں کے لئے تکلیف دہ انتظار کروانا---

غلط شہرت رکھنے والے پاکستانیوں کے ہاتھوں میں آلہ کار بنے رہنا---پاکستان
بہتری کے لئے سوچنے، کرنے، یا "کچھ کرنے کی کوشش کرنے" والوں کو اتنا
یشان کرنا کہ وہ تنگ آکر اپنا ارادہ ہی بدل دیں ہمارے سفارتکاروں کے وہ سنہری
نامے ہیں جن پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

امریکہ اور یورپ میں سربراہان مملکت سے ملاقات تو ممکن ہے---لیکن---
ہمارے سفیر یا ہائی کمشنر صاحبان---توبہ کیجئے صاحب توبہ کیجئے---

اس ضمن میں یوں تو مبالغہ آرائی کی بہت گنجائش ہے لیکن ایک بات بلاخوف و
ید کہی جاسکتی ہے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ پہلی ملاقات میں آپ کو ان
وارفع ہستیوں کا دیدار نصیب ہو جائے۔

ہاں!

ایک صورت ہے۔

اگر آپ کا تعلق پاکستان میں برسراقتدار ٹولے سے ہے آپ اس پوزیشن میں ہیں
متعلقہ صاحب کو کوئی نقصان پہنچا سکیں تو آپ ان کے "حسن سلوک" کے بہتر
رت مستحق ہیں۔

اس کے برعکس بھارتی سفارتکار بہت "ایکٹو" اور "سمارٹ"--- خصوصاً جب
، بھارت میں آزادی پسند تحریکوں نے زور پکڑا ہے یہ لوگ زیادہ چوکنے ہوگئے
ا--- مثلاً سکھوں کی مثال لیجئے۔

اگر کیلے فورنیا کی بات کریں تو یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ اس ریاست میں خالصتان نواز سکھوں کی مکمل فہرست سان فرانسسکو میں بھارتی قونصلیٹ کے پاس محفوظ ہے نہ صرف یہ بلکہ یہاں کے ہر قابل ذکر گوار دوارے میں ان کا عمل دخل ہے---ان کی لابی موجود ہے---اور خالصتان نواز سکھوں کو ہر وقت اس سے چوکنا رہنا پڑتا ہے۔

سان فرانسسکو کے بھارتی قونصلیٹ کو اس بات کی خبر رہتی ہے کہ اس مرتبہ مظاہرے میں کون کون حصہ لے رہا ہے؟

سکھوں کا پروگرام کیا ہے؟

ان کے ارادے کیا ہیں؟

یہیں تک نہیں بلکہ بھارتی سفارت خانے ایک طرح سے اپنے ملک کی انٹیلی جنس کے فرائض انجام دے رہے ہیں ہر وقت یہ لوگ جوڑ توڑ میں مصروف رہتے ہیں۔

جس ملک میں بھی رہیں وہاں کے پریس اور پولیس سے خصوصی تعلقات ق کرتے ہیں خصوصاً میڈیا میں اپنے اثر و رسوخ سے مخالفین کے خلاف پراپیگنڈہ جا رکھتے ہیں۔ امریکہ، کینیڈا اور لندن میں تو بھارتی سفار تکاروں نے فلموں، لٹریچر ذریعے باقاعدہ پراپیگنڈہ مہم جاری رکھی ہے۔

اسی طرح کشمیر کا مسئلہ لیجئے----

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 90 اور 91ء کے سال نکال کر ہمارے سفار تکاروں کبھی اس محاذ پر کام کرنے کی زحمت گوارہ کی ہو۔

اس کے برعکس بھارتی سفار تکاروں کو لیجئے۔

قیام پاکستان کے بعد سے آج تک شاید ہی انہوں نے یہ محاذ خالی چھوڑا ہو میں ورلڈ سکھ نیوز کی کر رہا تھا کہ یہ پرچہ چونکہ بھارت مخالف لابی کی نمائندگی کرتا

لئے بھارتی حکومت کی اس پر خصوصی نظر رہتی ہے۔ ایک مرتبہ اس پرچے سے منسلک ہونے کا مطلب ہے کہ اب بھارت میں داخلے کے دروازے بند ہوگئے۔

بھارتی حکومت یہاں کام کرنے والوں کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتی ہے۔ اس لئے اس پرچے سے کسی بھی بھارتی شہری کی وابستگی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

○

اندر جیت اور ڈھنڈسا نے میرے ساتھ سٹاکٹن سے سیکرامنٹو جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ واپسی پر ہم سٹاکٹن سے کچھ فاصلے پر دائیں ہاتھ دریا کی طرف مڑ گئے۔

اس جگہ کا نام "ریووسٹا" "Riovista" ہے----

دریا کنارے موجود اس چھوٹے سے ٹاؤن میں انسانی عقل کو ورطہ حیرت میں ڈالنے والا Foster,s Bighron سپورٹس مین ہیڈ کوارٹر موجود ہے۔

جنگلی جانوروں کے سروں والا عظیم الشان حنوط گھر ولیم بل فوسٹر نے جو امریکہ کا شہرہ آفاق شکاری تھا 1931ء میں قائم کیا----

فوسٹر یہاں ایسے حنوط گھر بنانا چاہتا تھا جہاں وہ دنیا کے تمام جنگلی جانوروں کے سر اکٹھے کرسکے اور یہ حنوط گھر پھر دنیا بھر میں ایک عجوبہ شمار ہونے لگے----

اس گمنام اور ہائی وے سے بالکل الگ تھلگ راستے پر واقع چھوٹے سے ٹاؤن کو فوسٹر اتنی شہرت دینے میں کامیاب ہوگیا کہ پھر دنیا کے کونے کونے سے سیاح اس کا حنوط گھر دیکھنے آنے لگے----

فوسٹر کیلے فورنیا کے ایک ٹاؤن "ہاورڈ" میں پیدا ہوا اور وہ جو کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات---نوعمری ہی میں اسے شکار کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

1918ء میں کیلے فورنیا میں "نیویارک" کے مقام پر اپنی جوانی افریقہ کے جنگلوں میں بھینٹ چڑھانے والے پہلے امریکی نژاد شکاری ہنری سنو نے بعد میں یہاں اپنی

فونڈری قائم کر لی تھی۔ فوسٹر اس کے پاس بطور اپیرنٹس ٹریننگ حاصل کر رہا
"ہنری سنو" کے ذریعے امریکیوں کو پہلی مرتبہ افریقہ کی جنگلی حیات کی تصاویر
فلمیں دیکھنے کا موقعہ ملا۔

نوجوان فوسٹر کو ہنری سنو کی شخصیت نے بہت متاثر کیا اور اس نے بھی افریقہ
جانے اور وہاں شکار کرنے کی ٹھانی۔

1919ء میں نوجوان فوسٹر نے افریقہ کی طرف جانے والے ایک بادبانی جہاز میں
سفر کیا اس مرتبہ وہ صرف اس تاریک اور پراسرار براعظم کے پوشیدہ اسرار سمجھنے کے
لئے ایک سیاح کی حیثیت سے گیا اور واپس لوٹ آیا۔

نو سال تک پھر اس نے جان توڑ محنت کی۔ زادراہ اکٹھا کیا۔ مختلف قسم کی شکاری
بندوقیں اور دیگر سازوسامان تیار کیا اور 1928ء میں جہاں نوردی کی نیت سے افریقہ
کی راہ لی۔ یہ اس کی زندگی کا طویل ترین سفر تھا جس میں اس نے دنیا کے متعد
براعظموں کی سیر کی۔ وہاں شکار کھیلا اور اپنے شکار کا لوہا بھی منوایا۔

وہ کئی کئی مہینے دنیا کے مختلف حصوں میں شکار کھیلتا۔ وہاں جنگلی جانوروں کو مارتا او
ان کے سر اور کھالیں یہاں "ریووسٹا" میں جمع کرتا رہا۔ اس کا یہ شوق جنون کی حدوں
چھونے لگا تھا۔

"آج بگ ہارن" دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد جانوروں کے حنوط شدہ سروں کا
ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں پائے جانے والے 300 سے زائد جنگلی جانورو
پرندوں مچھلیوں کے سر یہاں دیواروں میں سجے دنیا کے کونے کونے سے آنے والو
کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

بہت سی دیگر حیران کن چیزوں کے علاوہ یہاں افریقہ کے ہاتھیوں کے مکمل
موجود ہیں۔ تیرہ فٹ لمبے چیتے کی کھال دیوار میں نصب ہے اور 110 پونڈ وزن

تی دانت بھی یہیں سجائے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک کی لمبائی 5 فٹ ہے---
یہ دانت ان ہاتھیوں کے ہوں گے جن کے سر دیوار میں نصب ہیں اور ان سروں
ے دائیں بائیں یہ دانت لٹک رہے ہیں۔

یہاں کی ایک خصوصیت جو اس "بگ ہارن" کو ساری دنیا میں ممتاز کرتی ہے۔ دنیا
ے سب سے لمبے جانور Giraffe کا سر ہے ساری دنیا میں شاید ایک درجن اس
یت کے سر نہیں ہوں گے۔

موس Moose بھی امریکہ میں پایا جانے والا ایک بڑے بڑے سینگوں والا ہرن
جانور ہے۔ جس کی اونچائی قریباً ساڑھے پانچ فٹ ہوتی ہے۔ یہاں موس کا ایک
بانچہ ایسا رکھا ہے جس کی لمبائی 76 انچ ہے اور فوسٹر کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں اس سے
دہ لمبائی والا موس موجود نہیں۔

آج تک اس کا یہ دعویٰ باطل نہیں ہو سکا---!!

تاریخ میں یوں تو بہت سے حوالوں سے بہت سے انسانوں کو ممتاز مقام حاصل ہے
ن---!

ایک امتیاز جو اس عظیم شکاری کو حاصل رہا وہ ناقابل چیلنج ہے---

یہ "موس" جو 76 انچ لمبا ہے 1912ء میں لاس اینجلس میں کسی اور شکاری نے
ار کیا تھا اور فوسٹر نے یہ بات بطور خاص اس کے ساتھ لکھ دی ہے---

خیال رہے کہ امریکہ اور یورپ کے جس میوزیم، چڑیا گھر وغیرہ میں آپ جائیں گے
ں جو بھی چیز رکھی ہوگی اس کے ساتھ اس کا مکمل تاریخ جغرافیہ بھی موجود ہوگا۔

عموماً بڑے میوزیم میں ہر جانور، مشینری یا نوادرات کے نزدیک ایک پش بٹن ہوتا
ہے جسے آپ دبائیں گے تو فوراً ٹیپ آن ہو جاتی ہے اور اس سے متعلق تمام تر
علومات آپ کو سنائی جاتی ہیں۔

کئی جگہ بٹن دبانے پر ویڈیو فلم چلنے لگتی ہے اور متعلقہ شے کا مکمل تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

خیر! بات ہو رہی تھی جناب فوسٹر کی پیشہ وارانہ ایمانداری کی کہ موصوف اگر یہ کہہ دیتے کہ اس "موس" کو مارنے کا اعزاز بھی انہیں ہی حاصل ہے تو بھی کسی کی جرات نہیں تھی کہ ان کی طرف انگلی اٹھاتا۔

انہوں نے تاریخی بے ایمانی سے اجتناب برتا اور آج شکاریات کی تاریخ میں ان نام سنہری حروف سے رقم ہے۔

ایک ہمارے شکاری صاحبان ہیں کہ اخبارات میں اپنے نام اور تصاویر چھپوا کے لئے ایسے ایسے من گھڑت افسانے تراشتے ہیں کہ خدا کی پناہ----!!

اگر شکاری صاحب نے کبھی جوانی کے دنوں میں کوئی گیدڑ شکار کیا تھا تو بڑھاپے تک وہ چیتا بن چکا ہوتا ہے----

افسوس ہم تاریخ کو بھی محض اپنی بے جا خواہشوں اور اپنے اندر موجود حیوانیت کی بھینٹ چڑھانے سے نہیں چوکتے اور مسخ کرتے چلے جاتے ہیں----

خدا جانے جب آئندہ نسلیں ہمارے کارنامے پڑھا کریں گی تو وہ ہمارے اصلی او واقعی کارناموں کو بھی "اون" کریں گی یا انہیں بھی فراڈ اور فریب جان کر نظر انداز دیں گی؟

ہاتھی کے علاوہ جن اور جانوروں کے سر یہاں نمایاں نظر آتے ہیں ان میں ا درجن کے قریب مختلف النسل ہرن اور بارہ سنگھے، گینڈے، رینو سارس، شیر، چ برفانی اور جنگلی ریچھ اور جنگلی گائے شامل ہیں اور ان میں 95 فیصد سے زیادہ فوسٹر خود شکار کئے تھے۔

ولیم فوسٹر نے شکار زیادہ افریقہ، ہندوستان، گرین لینڈ، الاسکا، میکسیکو اور امریکہ میں کھیلا۔

25 سال پہلے ان جنگلی جانوروں کے سروں کو حنوط کرنے پر جو خرچ اٹھا تھا وہ اس طرح ہے۔

ہاتھی کے سر چار ہزار ڈالر----

Giraffe آٹھ سو ڈالر----

گینڈے پر چار سو پچاس ڈالر----

رینو سارس سر ساڑھے تین سو ڈالر----

افراط زر دنیا میں جس طرح بڑھا ہے اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ آج اس کی اہمیت کیا ہو گی۔

شاید ہمارے تصور سے بھی زیادہ۔

ولیم فوسٹر نے اپنی زندگی میں دنیا کے نامور شکاریوں سے دنیا کے مختلف حصوں میں ملاقاتیں کیں اور ان کے ساتھ مل کر شکار کھیلا۔

اپنی زندگی کے پہلے شکاری سفر کے دوران افریقہ میں اس کی ملاقات شہرہ آفاق مصنف اور شکاری ارنسٹ ہمینگوئے سے بھی ہوئی، فوسٹر کا کہنا ہے کہ تب ہمینگوئے ایک نوعمر لڑکا تھا۔

فوسٹر کی سینکڑوں تصاویر مکمل تفصیلات کے ساتھ اس "بگ ہارن" کی دیواروں پر نصب ہیں۔

1963ء میں فوسٹر نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔ 12 سال بعد دنیا میں اس کی واحد ساتھی اس کی بیوی بھی انتقال کر گئی۔

آج اس عظیم حنوط گھر کو شاندار ہوٹل ریسٹورنٹ کی شکل حاصل ہے اور ریو ٹسا

کی 143 مین سٹریٹ پر واقع یہ عجوبہ روزگار اب ٹونی، ڈورتھی براؤن اور ان کے بیٹے جان میکاڈو کے زیر کنٹرول ہے جہاں امریکہ کا بہترین کھانا اور شرابیں میسر ہیں۔

عظیم فوسٹر کی اس عظیم یادگار کو موجودہ مالکان نے مزید چار چاند لگائے ہیں۔ میں جب دونوں دوستوں کے ساتھ اس عظیم الشان عمارت میں داخل ہوا تو دیواروں پر نصب سینکڑوں جانوروں کے سر دیکھ کر دنگ رہ گیا---!!

اندر داخل ہوتے ہی ہمارا استقبال یہاں کی روایت کے مطابق مسز ڈورتھی نے کیا۔

بار روم کی لمبی میز کے ساتھ منسلک آرام دہ سیٹوں پر اپنے سامنے بیئر اور شراب کے جام سجائے ہم سے پہلے درجنوں لوگ یہاں موجود تھے۔ مسز ڈورتھی خود ساقی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

ہماری خصوصی فرمائش پر اس نے ہمیں تازہ پھلوں کا شیک بنا دیا ملک شیک کے یہ جام اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہم ہال نما کمروں میں گھومتے اور جانوروں کے حنوط شدہ سروں کے ساتھ اپنی تصاویر بناتے رہے۔ کہ ہم یہی کر سکتے تھے۔ یہاں کے ماحول میں ولیم کاربٹ کی کہانیوں والا تحیر اور اسرار موجود ہے۔

مدہم روشنی میں جانوروں کے حنوط کردہ سر، مختلف قسم کی شرابوں کی مہک نے ماحول کو خاصا مختلف بنا دیا تھا۔ خصوصی احتیاط کے پیش نظر سگریٹ پینے کی اجازت نہیں---!!

امریکہ کے باقی مقامات کے برعکس یہاں ہفتہ، اتوار کی بجائے منگل کی چھٹی ہو

ہے---

یہ روایت بھی شاید ولیم فوسٹر نے قائم کی تھی جسے ولیم کی روایتوں کے امین ا

طرح نبھا رہے ہیں۔

شام ڈھلنے پر جب ہم یہاں سے نکلے تو ریو وسٹا سے سٹاکٹن کی طرف جانے وا

ک سنسان اور سوچ میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی---

سورج ابھی مکمل غروب نہیں ہوا تھا---

ماحول پر اسرار یہ تہہ گہری ہو رہی تھی---

سڑک کے دورویہ میلوں تک پھیلے کھیتوں میں لہلہاتی فصلیں دیکھ کر رشک آ رہا تھا۔

کاش میرے وطن کے کھیت بھی اسی طرح اپنے مکمل پک کے ساتھ لہرانے

ں---!

سیم و تھور اور ہماری بدنیتی کی وجہ سے بانجھ ہوئی ہماری دھرتی پھر سے ہریالی اگلنے

ے---!!

کاش---!!

سٹاکٹن واپس لوٹے تو رات اترنے لگی تھی---!!

رات دیر گئے تک اندرجیت مجھے "ریو وسٹا" اور ولیم فوسٹر سے متعلق کہانیاں سناتا

○

،فورنیا میں یہ میری آخری رات تھی---

اگلے روز اندرجیت مجھے سیکرامنٹو کے ہوائی اڈے پر چھوڑ آیا جہاں سے امریکن

ائنز کی ایک پرواز پر میں فلاڈلفیا پہنچ گیا۔

ایئرپورٹ پر حسب سابق طاہرہ مجھے لینے آئی ہوئی تھی۔

یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ دنیا میں سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کے دعوے دار امریکن معاشرے میں عورت سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے۔

عورتوں کے خلاف تشدد میں آئے روز اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکن نوجوان جن کی غالب تعداد بے راہرو ہے عورت کو کھلونے سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ عورتوں پر تشدد عام ہے اور امریکن پریس کا بڑا حصہ ایسی ہی خبروں سے بھرا ہوتا ہے۔

امریکی حکام کی بیرونی مسائل پر توجہ کے باعث اندرونی مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ حالانکہ انہی مسائل و مشکلات کے سودمند حل کا نعرہ لے کر بل کلنٹن نے کامیابی کے زینے پر قدم رکھے تھے۔ لیکن کیا برسوں کے مسائل وہ پل بھر میں حل کر دیں گے؟ یہ بہت مشکل سوال ہے۔ اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور کی جنگی مشینری چلا بخشنے والی فیکٹریاں دیوالیہ ہو رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر برس مزدوروں کی کاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نوجوانوں میں بیروزگاری، صنعتی دیوالیہ پن اور نسلی تعصب میں اضافے کی وجہ سے سنجیدہ حلقے پریشان ہیں، آخر یہ مسائل کیسے حل ہوں گے نوجوان جو کسی ملک و قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امریکہ میں ان اکثریت مایوسی کا شکار ہو رہی ہے۔ ملک کے مستقبل اور اپنے ذاتی مستقبل کے حوالے سے یہ نوجوان ملک کے مستقبل کے بارے میں انتہائی غلط سوچ کے شکار ہو چکے ہیں

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نوجوانوں میں ملکی مسائل کی وجہ سے مایوسی کے جذبات احساس کمتری کو جنم دے رہے ہیں۔ ڈیپریشن اور ذہنی تناؤ میں اضافے کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں گہنا رہی ہیں۔

نوجوانوں کی ذہنی نشوونما اور افزائش کے حوالے سے کارنیگی کونسل کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ اس کونسل کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر روبی تاکاشی کا کہنا ہے کہ اساتذہ کے لئے طلباء میں شراب نوشی، سگریٹ اور منشیات کا استعمال پریشانی کا سبب نہیں ہیں جتنی ڈیپریشن اور ذہنی الجھنیں ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے ادارے نے ایک لاکھ نوجوانوں پر سروے کیا۔ جس کے مطابق یہ نتائج سامنے آئے کہ نوجوانوں کی اکثریت میں منفی سوچ کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ادارے کے اہلکاروں کے مطابق منفی سوچ ایک نئی علامت ہے جو بڑی شدت سے ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔

امریکی نوجوانوں میں موجودہ نظام کے بارے میں نہ صرف شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں بلکہ وہ خود کو موجودہ نظام کا حصہ بھی نہیں سمجھتے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ یہ نوجوان خود کو دوسرے افراد سے نمایاں کرنے کے لئے طاقت پر یقین رکھتے ہیں۔ منفی سوچ کی وجہ سے ایک طرف تو آئیڈیل ازم کا تصور ختم ہو رہا ہے اور دوسری طرف اس سے باہمی رشتوں میں نفرت و کدورت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ نوجوانوں کی اکثریت وحشیانہ جذبات بھی رکھتی ہے۔ حالیہ سروے کے مطابق امریکی نوجوانوں کی ایک تہائی تعداد موجودہ مسائل اور ذہنی تناؤ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے خودکشی کو ترجیح دیتی ہے۔ 1950ء کے مقابلے میں نوجوانوں میں خودکشی کے حالیہ رجحان میں بڑی ڈرامائی تبدیلی آئی ہے۔ مسٹر تاکاشی کے بقول "ہم بہت سنجیدہ مسائل سے دوچار ہو چکے ہیں۔"

نوجوانوں کی اکثریت اب بھی ایسے لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل ہے جو خود کو ختم نہیں کرنا چاہتے لیکن پھر بھی اس سوچ کا بھوت ہر وقت ان کے سر پر طاری رہتا ہے۔
امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے ملکی سطح پر ایک سروے کرایا جس میں 12 برس سے 17 برس کے نوجوانوں سے ملکی حالات کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی گئی۔ سروے کے نتائج بڑے حیرت انگیز تھے۔ اس کے مطابق 60 فیصد نوجوانوں کا خیال تھا کہ امریکہ کے خوشحال سال اور دن اب ختم ہو چکے ہیں۔ اسی طرح 12 سے 14 برس کے بچوں کی 55% تعداد نے اپنے بڑوں کے خیال سے اتفاق کیا اور کہا کہ امریکہ کی خوشحالی کا دور اب خاتمہ ہو چکا ہے۔

اسی قسم کے دیگر سروے بھی کیے گئے جن کے مطابق یہ نتائج سامنے آئے کہ کم عمر بچوں میں منفی سوچ کے جذبات میں ہر برس اضافہ ہو رہا ہے۔ خیال ہے کہ 1980ء کے اوائل سے اس تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا ہے لیکن حالیہ برس یہ گراف بہت بلند ہوا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کم عمر بچے جو جوانی کی وادی میں قدم رکھ رہے ہیں وہ خود کو بڑی عمر کا سمجھنے لگے ہیں۔ ایسے ہی بارہ برس کے ایک بچے کا کہنا ہے کہ جب میں نوجوان تھا تو مجھے ہر شخص اچھا نظر آتا تھا لیکن اب یہ کیفیت بدل چکی ہے۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور میری سوجھ بوجھ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

18 برس سے بڑی عمر کے نوجوانوں میں منفی سوچ کے جذبات میں اب کمی آئی ہے۔ بل کلنٹن اور نائب صدر الگور کی کامیابی کے بعد ان نوجوانوں میں ملکی مسائل کے حل کی امید جاگی ہے اور وہ مستقبل کے بارے میں کافی پرامید دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح ادھیڑ عمر امریکی کلنٹن کی کامیابی کو نوید قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح مسائل حل ہوں گے۔ امریکہ کے حالیہ مسائل کے بارے میں بھی یہ مثبت سوچ پائی جاتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سب کام آہستہ روی سے ٹھیک ہوں گے

امریکی ان مسائل کو کئی برس کی غفلت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہر شعبہ زندگی میں بنیادی اصلاحات کی ضرورت ہے۔

امریکی نوجوانوں میں منفی سوچ کے جن جذبات کا اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ میڈیا اور ذاتی تجربات اس حوالے سے کافی اہم ہیں۔ نوجوانوں کا خیال ہے کہ ملکی مسائل کی پیچیدگی کے بارے میں اخبارات کے ذریعے انہیں بہت کچھ سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے والدین بھی ان مسائل کے بارے میں ذکر کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی تجربات کی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ عملی زندگی میں انہیں جو مشکلات پیش آئیں بارہا وہ اس کا ذکر کرتے ہیں۔

جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں کہ ان کانوں میں بارہا یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ کریاں نہیں ہیں۔ ایسے میں وہ کسے مورد الزام ٹھہرائیں؟ آخری حل تو یہی ہے کہ ملک کے مستقبل کے بارے میں شوک کا اظہار کیا جائے۔ نوجوانوں میں مایوسی اور منفی سوچ کے جو آثار نظر آ رہے ہیں اس سے خطے کے استحکام کو بھی خطرہ ہے۔ ایسے میں آخر کیا نہیں غلط قرار دے دیا جائے۔ تاکہ اس طرح مسائل سے آنکھیں چرا لی جائیں؟

امریکی نوجوانوں میں یادداشت اور تاریخ کے بارے میں بھی معلومات کا فقدان ہے۔ اس طرح مختلف امور کے بارے میں بھی وہ صلاحیت سے عاری ہیں۔ ایسے ارے اور اعلیٰ شخصیات جو مایوس نوجوانوں کو مستقبل کے بارے میں یقین دہانیاں اسکتے تھے۔ دور دور تک ان کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ تعلیمی اداروں کی صورت ل بھی نوجوانوں کے دل و دماغ پر منفی اثرات ڈال رہی ہے۔ سکولوں میں دنگا فساد اور دھاڑ کے واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔ طلباء نہ صرف آپس میں لڑتے ا بلکہ اساتذہ کے ساتھ بھی ان کا رویہ توہین آمیز ہوتا ہے۔ ایک بارہ سالہ طالبہ کا ا ہے کہ میں سکول میں خود کو محفوظ نہیں سمجھتی۔ ہمارے سکول میں اوسطاً ہر ہفتے

تین لڑائیاں ضرور ہوتی ہیں۔ جس میں گالیوں اور گھونسوں کا آزادانہ استعمال کیا جاتا
ہے۔ بڑی عمر کے طالب علم اپنے سے کم عمر ساتھیوں سے نہ صرف بدتمیزی کرتے
ہیں بلکہ ان کا جیب خرچ تک چھین لیتے ہیں، جنسی بے راہ روی بھی سکول اور کالج کی
سطح پر بہت عام ہو چکی ہے۔ امریکی نوجوانوں میں مایوسی، منفی سوچ اور بے چینی کے جو
جذبات پائے جاتے ہیں ان پر اگر کنٹرول نہ کیا گیا اور سنجیدہ حلقوں نے ان اسباب کا
تدارک نہ کیا تو امریکہ "مایوس براعظم" بن جائے گا۔ اندرونی و بیرونی مسائل کی
نسبت اس طرف کلنٹن کی توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔

○

وہ لوگ جو اس حوالے سے مسلمانوں کی شادیوں کو ہدف تنقید بناتے ہیں شاید ان
کے لئے یہ اطلاع چونکا دینے والی ہو کہ امریکہ میں اب یہ سوچ جنم لینے لگی ہے اور ا
اسے حرامکاری سے نجات کا بہترین راستہ بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثا
امریکہ میں پایا جانے والا عیسائی فرقہ "مارمون" ہے۔
مارمون دراصل ایک قدیم زمانے کا پیغمبر، فوجی رہنما اور مورخ تھا۔ 1830
لگ بھگ ایک امریکی جوزف سمتھ نے جو ریاست نیویارک کے گاؤں کا باسی تھا، د
کیا کہ اس پر مارمون نے اپنی کتاب منکشف کی ہے اور اس نے اس کتاب کا ترجم
ہے۔ یہ کتاب بعد میں "بک آف مارمون" کہلائی اور اس فرقے کے ماننے والو
نزدیک مقدس ترین کتاب ہے۔ یوں جوزف سمتھ ایک نئے فرقے کا بانی بن
اگرچہ بنیادی طور پر یہ فرقہ عیسائیت ہی کی ایک شاخ ہے لیکن ان کے اکثر عقا
عیسائیوں کے عقائد سے خاصے مختلف ہیں۔ سب سے بڑا اختلاف تعدد ازدوا
سلسلے میں ہے۔ عام عیسائیوں کے نزدیک ایک وقت میں صرف ایک بیوی رکھے
حاصل ہے۔ مارمون اس کے برعکس کہتے ہیں کہ مرد جتنی چاہے شادیاں کر

بیویاں رکھ سکتا ہے۔

جوزف سمتھ کے عقائد اور تعلیمات نے عام عیسائیوں میں ہلچل پیدا کر دی اور
انہوں نے سمتھ اور اس کے پیروکاروں کا جینا حرام کر دیا۔ سمتھ اپنے پیروکاروں کے
ہمراہ نئے وطن کی تلاش میں چل پڑا اور نیویارک سے دو ہزار میل گریٹ سالٹ لیک
کے ویران کنارے پر ڈیرا ڈال لیا۔ یہاں انہوں نے نئے شہر سالٹ لیک سٹی کی بنیاد
رکھی۔ اگرچہ مارمونوں نے بعد میں متعدد دیگر قصبے۔ گاؤں اور شہر آباد کئے ان میں
لاس ویگاس بھی شامل ہے۔ لیکن ان کا اصل مرکز سالٹ لیک سٹی ہی ہے اور یہی ان کا
سب سے بڑا معبد ہے۔

کچھ عرصہ مارمون اپنے نئے شہر میں اپنے عقائد پر عمل کرتے رہے اور متعدد
عورتوں سے شادیاں کرتے رہے۔ لیکن امریکی حکومت نے لوگوں کے دباؤ پر ایک
سے زیادہ بیوی رکھنے پر پابندی لگا دی۔

میرا خیال تھا کہ مارمون عام عیسائیوں کی طرح صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے
ہوں گے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ یہاں اے بی سی پر ایک صاحب گیری سپرنگر کا
ٹاک شو ہوتا ہے۔ وہ ایک موضوع پڑکتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق مردوں
عورتوں بلکہ نوعمر لڑکیوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور حاضرین کے سامنے اس پر بحث
کرواتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ایک سولہ سالہ طوائف پکڑ لائے۔ یہ نوخیز طوائف
خاندانی طوائف نہیں تھی بلکہ حالات کا شکار ہو کر (جس میں والدین کی عدم توجہی،
عام بے راہ روی، بری صحبت، ڈرگز کا استعمال وغیرہ سبھی کچھ شامل تھا) یہ زندگی اختیار
کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ سپرنگر نے طوائف کی ماں اور نانی کو بھی بلا لیا اور کچھ
دوسرے لوگوں کو بھی۔ خوب بحث ہوئی اور کمپیئر نے اپنے خیالات سے ناظرین کو
مستفید کیا۔

یہی سپر نگر آج ایک مارمون کو بھی کہیں سے ڈھونڈ لائے۔ مارمون باریش تھا، شکل و صورت سے بہت بھلا مانس معلوم ہوتا تھا۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کی سات بیویاں اور پندرہ بچے بھی تھے۔ تمام بیویوں پر حاضرین نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور بعض نے انہیں نشانہ تضحیک بھی بنایا لیکن وہ اللہ کی بندیاں ایک ہی بات پر اصرار کر رہی تھیں کہ وہ اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہیں۔ ان پر شادی کے لئے کوئی دباؤ نہیں تھا اور سب نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ سب خوش و خرم تھیں اور ان کے بچے بھی خاصے صحت مند اور خوبصورت تھے۔ شرکاء میں ایک "ماہر نفسیات" بھی شامل تھے۔

انہوں نے سوال کیا----

"بیویوں کی برین واشنگ ہوئی ہے ورنہ کوئی سمجھدار عورت بقائمی ہوش و حواس کیسے کسی مرد کی دوسری یا ساتویں منکوحہ بن سکتی ہے۔ بچے دیکھنے میں ہی صحت مند نظر آتے ہیں ورنہ یہ لازماً ذہنی مریض ثابت ہوں گے۔"

جواباً فرمایا۔ سچ فرمایا۔ آپ ماہر نفسیات ہیں۔ آپ کی بات کی کون کافر تردید کر سکتا ہے۔ لیکن یہ جو سنگل مائیں بچے لئے پھر رہی ہیں اور جن کے بچوں کو غالباً ساری عمر باپ کی رفاقت تو کیا۔ اس کی غالباً شکل دیکھنا بھی نصیب نہ ہوگا، وہ تو ذہنی اعتبار سے سو فیصد تندرست بچے پیدا کر رہی ہیں!"

○

یہ مباحث امریکن معاشرے کا جزو لاینفک ہیں۔

"ہوم سویٹ ہوم" امریکنوں کے لئے خواب بن چکا ہے۔ وہ اپنے گھروں میں بھی دفتر جیسی زندگی جینے پر مجبور ہیں ترقی پسندی کی اس سے زیادہ اور کیا قیمت ادا جا سکتی ہے؟

مغرب والے حقوق نسواں کے بہت بڑے علمبردار ہیں اور اسی لئے انہوں نے عورت کو کچھ زیادہ ہی آزادی دے دی ہے۔ جسے "مادر پدر آزادی" کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس آزادی کے نتیجے میں رشتوں کی تقدیس ختم ہوئی ہے تو جذبوں کے احساسات بھی ناپید ہوگئے ہیں۔ اخلاقی بے راہ روی بڑھی ہے۔ جرائم بڑھے ہیں اور اس وقت موجودہ صورت حال یہ ہے کہ وہ لوگ سکون کی نیند حاصل کرنے کے لئے خواب آور ادویات کی کئی خوراکیں پھانک لیتے ہیں لیکن سکون پھر بھی انہیں نصیب نہیں ہے۔ یہ سب اسی آزادی کا نتیجہ ہے جس نے مغرب کی زندگی کو غلامی کے شکنجوں میں جکڑنا شروع کر دیا ہے۔ بچے والدین سے شاکی ہیں تو والدین بچوں کی نافرمانی کا دکھڑا روتے ہیں۔ خاوند اور بیوی کے جھگڑے بڑھ چکے ہیں۔ باہمی اعتماد کی فضا ختم ہو چکی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس آزادی کے نتیجے میں آج نہیں تو کل ضرور مغرب کی عورت اٹھ کھڑی ہوگی۔ وہ مرد سے اپنا حق مانگے گی اس کو جس طرح فیکٹریوں اور دفاتر میں کم معاوضوں پر رکھا جاتا ہے اس کا حساب مانگے گی۔ لیکن فی الوقت تو صورت حال اس کے برعکس ہے۔ امریکہ ہی کا جائزہ لیں تو یہ انکشاف بہت حیرت انگیز ہے کہ وہاں عورت نے اس آزادی کا بہت زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہے۔

شبینہ محفلوں اور کلبوں میں تو امریکی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لیتی ہی ہیں مگر اس کے علاوہ بھی امریکی عورتیں اب بہت زیادہ پر پرزے نکال چکی ہیں۔ اور آئندہ چند برسوں تک وہ خود مردوں کے حقوق تک غصب کرنے کا عزم رکھتی ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ امریکی عورتیں اپنے شوہروں اور دیگر مردوں کی بات بات پر توہین کرتی رہتی ہیں۔ انہیں حقارت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور اب تو انہوں نے ایسی انجمنیں بنائی ہیں جو صرف مرد کو نیچا دکھانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ سرکاری دفاتر، فیکٹریوں، شاپنگ پلازوں اور جہاں اور جس شعبے میں عورتیں مردوں

کے شانہ بشانہ روزگار کمانے میں مصروف ہیں وہاں ان کا رویہ مردوں کے ساتھ خراب سے خراب تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس حوالے سے کالوں اور گوروں کی کوئی تیز نہیں۔ لوگ سوچیں کہ گوریاں شاید کالوں سے الرجک ہوں گی مگر ایسی کیفیت نہیں ہے کالوں کے ساتھ گورے مرد بھی ان کی تنقید کا باعث بن رہے ہیں۔ عورتوں کی انجمنیں ہفتہ وار اجلاسوں میں مردوں پر تنقید کرنے کے لئے نت نئے بہانے تلاش کرتی ہیں بلکہ وہ پبلشنگ کے ذریعے بھی اس مہم کو بھرپور طریقے سے چلا رہی ہیں۔ کرسمس اور دیگر تہواروں پر وہ مردوں کو ایسے کارڈز ارسال کرتی ہیں جن میں ان کے خلاف بے ہودہ زبان استعمال کی گئی ہوتی ہے یا پھر ان کے خلاف لطیفے گھڑے جاتے ہیں۔

میکرسن نامی خاتون کا کہنا ہے کہ وہ اور اس کی سہیلیاں گاہے بگاہے ایسے کارڈ ایک دوسرے کو ارسال کرتی رہتی ہیں جن میں مرد کے خلاف بے ہودہ مذاق کیا جاتا ہے۔ جہاں چند امریکی عورتیں بیٹھتی ہیں وہ اپنے شوہروں یا دیگر مرد عزیزوں کیخلاف شکوے شکایتیں کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنا دکھڑا سناتی ہیں اور کوشش کر ہیں کہ کسی طرح ان کے دل کا غبار کم ہو جائے۔

امریکی مرد بھی موجودہ صورت حال میں اپنے دفاع کے لئے سرگرم ہو چکے ہیں جان مچیٹو نامی نفسیاتی معالج کا کہنا ہے کہ عورتیں مردوں کے خلاف اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہیں۔ یہ عورتیں مردوں کو نیچا دکھا کر آخر کیا حاصل کرنا چاہتی ہیں میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ پریشان کن بات یہ ہے کہ آخر انہیں سمجھائیں تو کیسے سمجھائیں۔ عورتوں نے کئی ایسے لطیفے بنا رکھے ہیں جن میں مردوں کی توہین کی گئی۔ اور اگر ان سے اس سلسلے میں باز پرس کی جائے تو وہ کہتی ہیں کہ یہ تو محض مذاق ہے ا اگر ہم مرد عورتوں کے خلاف یہ تمام حرکات شروع کر دیں۔

ان کے بارے میں بیہودہ قسم کے لطیفے بنائیں تو وہ اس پر سیخ پا ہو جاتی ہیں۔ ا

اپنی آزادی پر حملہ تصور کرتی ہیں۔ جان مچیٹو کے یہ خیالات بجا لیکن مس میکرسن تو کچھ سننا ہی نہیں چاہتیں۔ میکرسن نے جان مچیٹو کی گفتگو کے حوالے سے بتایا کہ کارڈز پر جو لطیفے درج ہوتے ہیں وہ روزمرہ زندگی کے تجربات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بات گھڑی نہیں گئی ہوتی اس لئے مردوں کو اس بات کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ جان مچیٹو اور اس کے دوستوں نے ایسے اداروں سے بھی رابطہ کیا ہے جو مردوں کے خلاف بے ہودہ کارڈز چھاپتے ہیں اور اس کی فروخت سے کثیر منافع حاصل کرتے ہیں۔ جان مچیٹو کا کہنا ہے کہ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ یہ ادارے مردوں کے خلاف یکطرفہ رویہ ترک کر دیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ پبلشنگ کا کام بند کر دیں۔ کیونکہ آخر اس کام سے تو ان کا روزگار وابستہ ہے۔ وہ اتنا کر سکتے ہیں کہ اگر لطائف چھاپنے ہی ہیں تو عورتوں کے خلاف بھی کچھ چھاپ دیا کریں۔

اگر جان مچیٹو کی بات پر یہ ادارے عمل کرنا شروع کر دیں اور عورتوں کے خلاف بھی کارڈز کی چھپائی شروع کر دیں تو امریکہ میں ایک نئی جنگ چھڑ جائے گی اور جھگڑا اتنا بڑھ جائے گا کہ عورتیں اور مرد کبھی ایک جگہ اکٹھے نہ ہو سکیں گے اور یہی اس آزادی کا انجام ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

کونسل آف مساجد آف نارتھ امریکہ ایک ایسی کونسل ہے جس میں تمام امریکہ اور کینیڈا کی مساجد اور مسلم ورلڈ لیگ کا حصہ ہے جس کا قیام 1975ء میں مکہ مکرمہ میں عمل پذیر ہوا اس کونسل کا مقصد ورلڈ لیگ کے اس اجلاس میں یہ بتایا گیا کہ کس طرح معاشرے میں مسجد کے کردار کو ایک بار پھر فعال بنایا جائے جیسا کہ اسلام کے مایہ ناز دور میں ہوتا رہا۔

اس میٹنگ میں اس پر زور دیا گیا کہ مسجد جو ایک زمانہ میں مسلمانوں کی مذہبی، سوشل، سیاسی، معاشرتی، تعلیمی نشوونما کا محور ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اپنا اثر ورسوخ کھو چکی ہے۔ اس کا بنیادی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم امت کا نظریہ جاتا رہا چنانچہ ان خوبصورت جذبات کے ساتھ اس کونسل کی داغ بیل ڈالی گئی اور اس کے محور کو عالمی سطح پر استوار کیا گیا اور آج بھی ورلڈ سپریم کونسل آف مساجد کا ہیڈ کوارٹر مکہ مکرمہ میں ہے۔

امریکہ میں اس کا قیام ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا حالانکہ 1977ء میں ورلڈ کونسل کے تحت ایک کانفرنس نیویارک میں منعقد ہو چکی تھی نارتھ امریکہ کی اس کونسل کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں ہے۔ اگرچہ اس کی سرگرمیاں ابھی تک محدود تھیں مگر گزشتہ چند ماہ سے کونسل کے مخلص لوگوں کی کوشش تھی کہ امریکہ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر اس کونسل کو مزید فعال بنایا جائے۔ چنانچہ شکاگو میں تین روزہ کانفرنس کا اعلان ہوا۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مندوبین کو دعوت نامے مع سفری ٹکٹ اور شکاگو کے عالیشان ہلٹن ہوٹل میں قیام طعام کے بھجوائے گئے۔ دعوت نامے کونسل میں شامل تمام مساجد کے اماموں یا پھر مسلم سینٹروں کے صدور کو بھیجے گئے اب اسے کیا کہیں کہ نہ تو ہم امام تھے نہ مقتدی بس یہ مولانا کاشمیری کی صحبت تھی کہ جس نے اس ہیچمداں کو بھی اس قابل جانا اور ایک روز ڈاکٹر طلحہ ایک دعوت نامہ میرے نام بھی لے آئے پھر ڈاکٹر صاحب ہی میرے ہم سفر بھی بنے----

○

شکاگو ایئرپورٹ دنیا کے مصروف ترین ایئرپورٹ میں سے ہے مگر جمعہ کے روز صبح گیارہ بجے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے امریکہ میں اسلام کا بول بالا ہو گیا ہو۔

تمام شہروں سے کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والوں کی السلام علیکم کی باز گشت ایک عجیب منظر پیدا کر رہی تھی۔

شکاگو کی پامر ہاؤس ہلٹن ہوٹل میں لابی سے صرف السلام علیکم کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں سیاہ فام امریکی مسلمانوں میں ایک خاص بات ہے کہ وہ زیادہ جذباتی ہیں۔ اور چونکہ وہ سوچ سمجھ کر اسلام لاتے ہیں اس لئے انہیں اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے اور اس کا ڈنکا وہ بڑے زور وشور سے بجاتے ہیں عربی زبان سے انہیں بہت زیادہ واقفیت نہیں ہے اس لئے جو چند ایک جملے ہیں انہیں بکثرت استعمال کرتے ہیں مثلاً کسی بھی چیز کی تعریف کریں تو وہ فوراً ماشاء اللہ کہیں گے۔

کسی چیز کی عظمت کا ذکر کرتے ہی اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں گے۔

پوچھئے حال کیسا ہے تو مجال ہے جو انگریزی میں جواب دیں، الحمد اللہ کہیں گے۔

پھر ہمیشہ برادر کہہ کر پکارتے ہیں نماز کی پابندی کرتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کو جاہلیت سے نجات دلانے میں سب سے کامیاب اسلام

ی رہا ہے۔ اگرچہ امریکہ میں سیاہ فام شخص محض اپنی ہیبت سے مجرم گردانا جاتا ہے اور مریکیوں کے لئے اس کی حیثیت آج بھی منشیات فروش، بدمعاش، چور، اچکے، سے زیادہ نہیں۔ وہاں بھی اگر کسی گورے امریکی کو علم ہو جائے کہ یہ سیاہ فام مسلمان ہے تو وہ اس سے خوفزدہ نہیں ہوتا اور اسے بھی "نارمل" انسان سمجھتا ہے اگر یہ معلوم ہو کہ متعلقہ شخص مسلمان ہے تو تمام اندیشے ختم ہو جاتے ہیں یہ اعجاز ہے اسلام کا کہ وہ وحشیوں کو انسانی عظمت کی مثالیں بنادیا کرتا ہے---- افسوس ہم تو مسلمان ہو کر درندے بن گئے اور امریکی سیاہ فام درندے تھے مسلمان بنتے ہیں تو انسانیت کا فخر بن جاتے ہیں۔ اسی لئے سیاہ فاموں میں یہاں اسلام کی تبلیغ کی بڑی گنجائش ہے۔ کونسل کی اس میٹنگ میں اکثریت سیاہ فاموں کی تھی۔ تاہم پاکستانی، ہندوستانی اور عرب نژاد لوگ بھی خاصی تعداد میں تھے۔

○

کونسل کے پروگرام میں متعدد سیمینار لیکچر اور ورکشاپ شامل تھیں افتتاحی سیشن میں کانگریس مین اور سینٹ کے ارکان شریک ہوئے۔ خطبہ استقبالیہ ورلڈ مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے پیش کیا۔ میٹنگ کے چیئرمین ڈاکٹر وصی اللہ خان تھے۔ جو شکاگو ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔ امام کعبہ شیخ علی الخصیفی بھی موجود تھے۔ اگلے روز ڈاکٹر قطبی احمد نے جو نارتھ امریکہ کی کونسل کے سکریٹری جنرل ہیں خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ان کے بعد باقاعدہ سیشن کا آغاز ہوا پہلے سیشن کا عنوان تھا "شمالی امریکہ میں اسلامی انفرادیت کا تحفظ اور مسلم خاندان کا کردار" اس موضوع پر ڈاکٹر الیاس بایونس نے بڑی پر مغز تقریر کی ڈاکٹر الیاس نیویارک میں سوشیالوجی کے پروفیسر ہیں۔ دوسرے سیشن کا عنوان تھا "غیر اسلامی ماحول میں مسلم فیملی لاء کا تحفظ" اس عنوان سے ڈاکٹر مدثر صدیقی نے اپنا مقالہ پڑھا جو میری ذاتی

رائے میں تین روزہ کانفرنس کا سب سے زیادہ پر مغز مقالہ تھا۔ اور اپنے ڈاکٹر صدیقی نے جو ہارورڈ کے فارغ التحصیل وکیل ہیں اور جو بیک وقت انگریزی عربی اور اردو پر عبور رکھتے ہیں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا اور ثابت کیا امریکی آئین اور قانون کی موجودگی میں بھی اسلامی قانون نافذ ہو سکتا ہے۔

○

اگلے سیشن میں وقف اور مسجد کے امور زیر بحث آئے جس میں تاریخی حوالے سے مسجد اور وقف کی اہمیت اجاگر کر گئی۔ اس کے بعد دعوت حق کے موضوع پر تقریر ہوئی کہ کس طرح شمالی امریکہ میں تبلیغ ہوا سے ڈاکٹر مزمل صدیقی نے پیش کیا جو مدثر صدیقی کے بڑے بھائی ہیں اور علم و قابلیت میں بھی بلند ترین بحیثیت مجموعی اس کانفرنس کا نکتہ عروج سنیچر کے ظہرانے سے لوئیس فرخان کا خطاب تھا۔ لوئیس فرخان نیشن آف اسلام نامی تنظیم کے لیڈر ہیں اور ان کے تیز اور جذباتی بیانات نے انہیں امریکہ میں انتہائی معروف بنادیا ہے۔

وہ بلا خوف سچ بات کرنے میں مشہور ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ امریکہ میں فرخان جیسا دوسرا مقرر موجود نہیں ہے۔ ان کے گروپ نے امریکہ کی چند جرائم سے آلودہ آبادیوں کو جس طرح جرائم سے پاک کیا ہے اس سے ان کی اہمیت اور مسلم ہو گئی ہے۔ فرخان کا خطاب اس لئے اور زیادہ اہمیت اختیار کر گیا کہ کانفرنس کے شرکاء میں سعودی عرب میں امریکی افواج کی موجودگی پر شدید عدم اطمینان پایا جاتا تھا مگر کھل کر بات نہیں ہو رہی تھی تاہم کانفرنس کے شرکاء کا جوش قابل دید تھا۔ ان میں سرفہرست کیلی فورنیا سے آئے ہوئے پاکستانی نژاد نثار حقی تھے پہلے انہوں نے کوشش کی کہ گلف کی سیاست بھی ایجنڈے پر لائی جائے مگر وہ ممکن نہ تھا۔ پھر انہوں نے قرارداد پیش کرنے کی درخواست کی۔ اس دوران وہ ایک سوالنامہ لے کر آئے جسے

شرکاء محفل میں پیش کیا جس میں سعودی حکومت کی جانب سے امریکہ کو دعوت دیئے پر شدید تنقید تھی اور یہ مطالبہ تھا کہ امریکی افواج فی الفور واپس بلائی جائیں۔ اور اس کی جگہ اسلامی فوج تعینات کی جائے۔

اس سوالنامے پر 90% لوگوں نے مثبت جواب دیا۔ پھر انہوں نے بآنگ دہل کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس کا انگریزی ترجمہ کیا اور یہ واضح کیا کہ محمد ﷺ سے ان کی مراد محمد بن عبداللہ ہے۔ جو عرب تھے۔ کیونکہ کچھ لوگ یہ غلط فہمی پھیلاتے تھے کہ فرخان کی مراد امام فرہاد محمد سے ہے جنہوں نے علیجاہ محمد کو مسلمان کیا تھا۔ ان کے اس اعلان پر تمام حاضرین وخور جذبات سے کھڑے ہوگئے اور دیر تک اللہ اکبر کے نعرے لگاتے رہے۔

خاص طور پر سیاہ فام، مسلمانوں کا دوسرا گروپ جن کی قیادت امام وارث محمد کرتے ہیں جو علیجاہ محمد کے بیٹے ہیں اور جنہوں نے اپنے والد کے چند اختلافی خیالات کو ترک کر دیا ہے اور اب ان کی مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔

کانفرنس کے الوداعی ظہرانے میں باکسر محمد علی بھی شریک ہوئے۔ محمد علی بلاشبہ امریکہ کی مقبول ترین شخصیت ہیں۔ انہیں امریکی کانگریس سے لے کر وہائٹ ہاؤس تک رسائی حاصل ہے اور اکثر سیاسی مشن پر وہ کانگریس کے چکر لگاتے ہیں۔ تاہم ان کی بیماری نے انہیں بے حد کمزور کر دیا ہے دوائیں اپنے اثرات دکھاتی ہیں گو بظاہر وہ صحت مند ہیں مگر ان کی جسمانی پھرتی جس کے لئے کبھی ساری دنیا حیران رہ جایا کرتی تھی اب ماضی کا خوبصورت خواب بن چکی ہے۔

الوداعی ظہرانے سے امام وارث محمد نے خطاب کیا۔ امام وارث کے ساتھ سیاہ فا مسلمانوں کی عقیدت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ امام وارث نے بھی اپنی تقریر میں کہا کہ اس کانفرنس کا نکتہ عروج برادر فرخان کا اعلان ہے اور اب ہم لوگ آپس میں م کر تبلیغ اسلام کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

کانفرنس میں کئی قراردادیں منظور ہوئیں جن میں سر فہرست امریکی افواج سعودی عرب سے واپسی کا مطالبہ تھا۔ کانفرنس سے تمام شرکاء تبلیغ اسلام کے لئے ایک نیا جوش اور ولولہ لے کر اٹھے جسے دیکھ کر کم از کم میرے جیسے کمزور اور انتہائی گنہگار مسلمان کا دل بھی امید کے جذبات سے اور آنکھیں شکر خداوندی کے احساس سے بھر آئیں۔ دل نے کہا کہ ضرور ایک دن ایسا آئے گا جب ہم بے نوا اور بے بس مسلمان جنہیں حکمرانوں کی بداعمالیوں نے آج دنیا میں رسوا کر کے رکھ دیا ہے اللہ کی نصرت اور تائید کے بھروسے پر اگر اپنے ایمان پر قائم رہے تو وہ دن دور نہیں جب عالمی سازشوں کے باوجود جو مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم دنیا روا رکھتی ہے ضرور نشاءاللہ اپنا کھویا ہوا اعزاز حاصل کر لیں گے----

آج امریکہ میں 60 لاکھ مسلمان آباد ہیں----

میرا دل کہتا ہے کہ ان کی ایک چوتھائی تعداد غیرت ایمانی سے سرشار ہے اور وہ ں مادیت پرست معاشرے میں رہنے کے باوجود ضرور یہ سوچتے ہیں کہ عالم اسلام کو وقیر کیسے حاصل ہو----

ہماری گمشدہ عزت، کھویا ہوا مقام کیسے لوٹے----

وہ دن انشاءاللہ ضرور آئے گا جب ہم سرخرو ہوں گے اور مغرب میں اسلام کی شاۃ ثانیہ کا عروج دیکھنے کو ملے گا۔

امریکہ کی آبادی میں سیاہ فام افراد کا حصہ بیس فیصد ہے لیکن امریکہ میں بسنے الے سیاہ فام افراد موثر قیادت کے فقدان کے باعث بکھرے ہوئے ہیں اور امریکی یاست پر ان کا وہ اثر اور وزن نہیں جو ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ امریکی سیاہ فام امریکی یاست میں دلچسپی نہیں لیتے۔ مجھے متعدد سیاہ فام افراد سے ملنے کا اتفاق ہوا ان کی کثریت اپنے حلقے میں پارلیمینٹ کے ممبر کے نام سے واقف نہیں تھی۔

متعدد سیاہ فام افراد نے ووٹ ہی نہیں بنایا۔ اور انہوں نے گذشتہ کئی سالوں سے
اپنے اس حق کو استعمال ہی نہیں کیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ امریکہ میں بسنےوالے
تمام سیاہ فام افراد میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے اور ان میں امریکی سیاست میں آگے
بڑھنے کی تڑپ پیدا کی جائے اس وقت سیاہ فام امریکی امریکہ نیویارک اور واشنگٹن
سمیت اہم شہروں کے میئر ہیں۔ ۲۰ فیصد امریکہ سیاہ فام اگر اکٹھے ہو جائیں تو امریکہ کا
مستقبل امریکہ کی سیاست نہ صرف ان کے ہاتھ میں ہوگی بلکہ امریکی خارجہ پالیسی کی
بنیادی اساس اور ترجیحات بدل جائیں گی جو ایشیا اور افریقہ کے مفاد میں ہوں گی۔

○

امریکہ کی معاشرتی زندگی کے بعض پہلوؤں سے پردہ اٹھائیں تو نہایت خوفناک
مناظر سامنے آتے ہیں۔ اس کی تہذیب کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ اس کا فلسفہ زندگ
شتر بے مہار کی طرح ہے۔ جدھر منہ اٹھ گیا۔ اسی رخ پر چلتا گیا۔ امریکی زندگی کا فلسف
یہ ہے کہ ایک فرد کوئی جرم کرے تو وہ مستحق عقوبت لیکن قوم کوئی جرم کرے تو لا
تحسین اور اس کا جرم تہذیب و ثقافت اور قابل فخر طریق زندگی پاتا ہے۔ مثال
طور پر ایک فرد نے چوری کی۔ مغربی قانون فوراً حرکت میں آگیا اور چور کو سزا دید
لیکن یہی چوری جب کوئی ادارۂ کرتا ہے تو قانون منہ میں قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے او
یہ چوری پوری قوم میں سرایت کر گئی تو یہ عین تہذیب و ثقافت اور قانون بن گئی۔
امریکہ میں ایک زمانے میں شراب نوشی کو ممنوع قرار دینے کی بڑی کوشش
تھی لیکن دیکھا گیا کہ خود قانون ساز اور قانون نافذ کرنے والے بھی اس عادت
دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ پولیس ان افراد کو پکڑ کر لے گئی تو تھوڑ
بعد دیکھا گیا کہ پولیس کے سپاہی بھی ملزمان کے ساتھ شغل شراب نوشی میں
ہو گئے۔ امریکی قومی لیڈروں نے یہ طے کیا کہ شراب نوشی پر پابندی لگانا غلط ثا

ہے۔ امتناع شراب کا قانون کچھ عرصہ نافذ رکھنے کے بعد منسوخ کر دیا گیا اور شراب
نوشی قوم کا شعار بن گئی۔ گویا ایک فرد کے لئے جو جرم تھا پوری قوم نے شروع کیا تو
تہذیب و ثقافت کا خصوصی حصہ بن گیا۔ امریکی اخبارات اور جرائد میں اداروں کے
جرائم کے بارے میں بہت کچھ شائع ہوتا رہا ہے یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ نے ایک
بڑی دلچسپ رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا کہ افراد کے جرائم تو نمایاں ہو جاتے ہیں۔
یکن اداروں کے جرائم مخفی رہتے ہیں اور قانون کا ہاتھ بھی انہیں نہیں پکڑ سکتا۔
قانون کے ایک پروفیسر نے کہا کہ اگر اداروں کے جرائم کی تفصیل جمع کی جائے قوم
نگشت بدنداں رہ جائے۔ اس رپورٹ میں خیانت اور بددیانتی کی بعض دلچسپ مثالیں
ی گئی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک شہری نے دودھ والوں کے خلاف رٹ دائر کر دی کہ دودھ
ں نے مناسب منافع کی بجائے لوٹ مچا رکھی ہے عدالت نے دودھ کی لاگت اور
ت کا جائزہ لینے کے لئے ماہرین کو طلب کیا۔ تحقیق کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی
25 دودھ فروش کمپنیاں دس برس سے گاہکوں سے دس فیصد زائد قیمت وصول کر
ی تھیں۔ عدالت نے ان کو 67 لاکھ ڈالر جرمانہ کیا لیکن وہ جرمانہ تو حکومت (سٹیٹ)
، خزانہ میں چلا گیا۔ جن لوگوں کو اتنی مدت لوٹا گیا تھا ان کی کوئی تلافی نہ ہو سکی۔
امریکہ میں قومی صحت کے لئے اربوں ڈالر مخصوص کئے جاتے ہیں۔ کوئی شہری
پڑ جائے تو اس کا علاج معالجہ حکومت کے ذمہ ہے۔ ڈاکٹروں کو اختیار ہے کہ وہ اس
لئے نسخہ تجویز کر کے ادویات بھی فراہم کریں۔ ادویات کی فراہمی کے لئے ہر شہر
ڈرگ سٹور ہیں۔ اب ان کی سپلائی میں کیسے گھپلا کیا جاتا ہے وہ ملاحظہ ہو۔ ایک
بہ اوہیو شہر کا ایک کیس عدالت میں پیش ہوا، مقدمہ کی سماعت کے دوران معلوم
کہ اوہیو کے میڈیکل پروگرام میں پانچ لاکھ ڈالر کی خیانت ہوئی ہے۔ ٹیکس کی چوری

تواہل امریکہ کے لئے شیر مادر ہے۔ رپورٹ میں پوری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے
کہ عام تاثر یہ ہے کہ جرم سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا لیکن اداروں کے جرائم نے ثابت
کر دیا ہے ہر جرم سے فائدہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک بہت بڑی کمپنی ایک کروڑ 20 لاکھ ڈالر
کی ٹیکس چوری میں ملوث پائی گئی ہے لیکن اس کے عام قانونی حصہ دار ڈائریکٹر کمپنی کی
کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھے۔

○

ملک میں قانون کے پرجوش نفاذ اور مجرموں کے ساتھ پولیس کے سخت رویے
کے باعث گزشتہ پانچ سال میں جرائم کی شرح میں خاصی کمی ہو گئی تھی لیکن گزش
سال کے اختتام تک ایک اعشاریہ آٹھ فیصد اضافہ ہوا ہے مغربی امریکہ میں ر
والے لوگ زیادہ تر مجرموں کی سرگرمیوں کا شکار ہوئے لیکن شمال مغربی امریکہ م
رہنے والے جرائم کی اس لہر سے کم متاثر ہوئے تھے۔

بیورو آف جسٹس کے اعداد و شمار کے ایک جائزے میں اس حقیقت کا انکشاف
کہ امریکہ میں جرائم کی رفتار خوفناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ قومی اعتبار سے گھریلو
کے جرائم کی تعداد 6 لاکھ 13 ہزار سے بڑھ کر 3 کروڑ 47 لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ نیـ
کرائم سروے کے مطابق گزشتہ سال 3 کروڑ 41 لاکھ مقدمات درج ہوئے تھے
گزشتہ پندرہ سال میں سب سے کم تھے۔ جرائم میں اضافہ ہونے کے باوجود مقدما
تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایڈمنسٹریشن حکام کا کہنا ہے کہ جرائم میں کمی کا سبب عوام کا تو
سے زیادہ قانون پر سختی سے عملدرآمد کرانا تھا۔

اکیڈمی کے بعض ماہرین نے ان اعداد و شمار کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔
1980ء کے عشرے میں نوجوانوں میں جرائم کم ہو گئے ہیں۔ ماہرین آبادیات کا کہ

ہ 1990ء کے ابتدائی عشرے تک اس گروپ کے لڑکوں میں جرائم کا رجحان کم ہوا
ہے جبکہ بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ جرائم کی سطح غیر متوقع طور پر بہت بڑھ چکی
ہے۔ غالباً گزشتہ سال جرائم میں اضافے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جرائم کا ارتکاب
م آمدنی والے گروپس میں زیادہ ہو گیا ہے گزشتہ سال چاروں قسم کے جرائم مثلاً زنا
لجبر، ڈکیتی، چوری اور گھیراؤ میں اضافہ ہوا ہے۔ اس میں قتل بھی شامل ہے۔ گھریلو
رائم میں تین لاکھ 60 ہزار یا دو اعشاریہ تین فی صد اضافہ ہو کر ان کی تعداد ایک کروڑ
ہ لاکھ ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اٹھائی گیری رسہ گیری اور موٹر وہیکلز کی چوری
ں بھی اضافہ ہوا ہے۔

1990ء میں مغربی امریکہ میں ذاتی جرائم کی شرح 125ء فی ہزار تھی۔ گھریلو
رائم کی تعداد مغرب میں 323، وسط مغرب 166، جنوب میں 79 اور شمال مشرق
ں 116 فی ہزار تھی۔ مغرب ہی وہ علاقہ ہے جس میں گزشتہ سال کم جرائم ہوئے
ے جبکہ شمال مشرق اور وسط مغرب میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا۔ یہ سروے 46 ہزار
روں میں رہنے والے 93 ہزار لوگوں سے سوالات کرنے کے بعد نیشنل کرائم
روے نے مرتب کیا ہے۔

○

الف بی آئی کی ایک رپورٹ کے مطابق نیویارک امریکہ میں ڈکیتی کی وارداتوں کا
ب سے بڑا مرکز بن چکا ہے۔ گزشتہ سال نیویارک میں مجموعی طور پر 93377
نیاں ہوئیں جس کا مطلب ہر چھ منٹ کے بعد ایک ڈاکہ ہے سرکاری ذرائع کے
بق اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ امریکی عوام میں اسلحہ اور باڈی گارڈز رکھنے کے
ان میں اضافہ ہو رہا ہے اسی طرح سنگین جرائم کے سلسلے میں قتل کی وارداتوں میں

واشنگٹن پہلے نمبر پر ہے جہاں عوام پر ہمہ وقت قتل کا خوف طاری رہتا ہے۔

○

امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں باشندے بنیادی ضرورتوں سے محروم زندگی گزا
رہے ہیں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بے گھر افراد کی بہت بڑی تعداد زیر زمی
ٹرینوں اور پلیٹ فارموں پر رہتی ہے جو موسمی اثرات سے ان کو محفوظ رکھتے ہیر
ایسے بے گھر افراد کی تعداد نیویارک میں 60 ہزار۔ لاس اینجلز میں 30 ہزار۔ شکاگو!
20 ہزار اور سان فرانسسکو میں ۵۰ ہزار سے زائد ہے۔ کیا کوئی بھی امریکی رہائش
حق کو بنیادی انسانی حقوق میں شامل کرنے کے حق سے انکار کر سکتا ہے؟

اس سوال کا حتمی جواب جو بھی ہو لیکن سرکاری طور پر جمع شدہ اعداد و شمار
مطابق امریکہ میں بے گھر افراد کی مجموعی تعداد چار لاکھ ہے۔ جبکہ قومی اکیڈمی بر
سائینسز کی رپورٹ کے مطابق یہ تعداد ساٹھ لاکھ 35 ہزار ہے۔ کیلے فورنیا یونیو
کی شماریاتی رپورٹ، قومی اکیڈمی کی رپورٹ کے اندازوں سے ہم آہنگ ہے جس
مطابق امریکہ میں بے گھر افراد کی تعداد 30 لاکھ ہے۔

سرکاری طور پر ان عددی حقائق کو پروپیگنڈے کا نام دے کر عالمی برادر
آنکھوں میں دھول ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے اور بے گھر افراد کو کام چور او
مریضوں کے کھاتے میں ڈالا جارہا ہے۔ اس ضمن میں شکاگو یونیورسٹی کی پروفیسہ
سوس نے اس دلیل کو مسترد کر دیا اور بتایا بے گھر افراد پہلے ملازمتیں کر رہے تھ
ان میں سے بیشتر چھ ماہ سے بے گھر ہیں امریکی پروفیسر کی تحقیق کا دائرہ کار شکا
محدود ہے بہرحال یہ بات حتمی ہے کہ امریکہ کی کل آبادی 24 کروڑ 61 لاکھ
پر مشتمل ہے لیکن صرف 5 کروڑ 47 لاکھ 24 ہزار افراد کے پاس ذاتی مکانات ؟

مغرب کے بیشتر ممالک کے بارے میں صرف ایسی ہی خبروں پر غریب ممالک
کے عوام یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں کے عوام عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔
معاشرہ میں اعلیٰ اقدار فروغ پذیر ہیں اور یہ ممالک تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہیں یہی وجہ
ہے کہ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال وغیرہ سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ
امریکہ جانے کے لئے ہر غیر قانونی طریقہ اختیار کرتے ہیں تاکہ وہ امریکہ میں اعلیٰ زندگی
گزار سکیں اس امر سے قطع نظر کہ وہاں کے عوام کا اصل معیار زندگی کیا ہے؟

ورلڈ سکھ آرگنائزیشن، سکھوں کی کم از کم امریکہ کی سطح پر ایک مربوط اور منظم
جماعت ہے جس میں زیادہ تعداد امریکہ میں موجود متمول سکھوں کی شامل ہے---
اس تنظیم میں نامور سکھ دانشور، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان اور صنعتکار شامل ہیں۔
اس تنظیم کی سرگرمیاں محدود ضرور ہیں لیکن بڑی ٹھوس اور جاندار بھی ہیں مثلاً
یہ لوگ امریکہ میں پناہ کے لئے آنے والے ان سکھ نوجوانوں کی دامے درمے قدمے
سخنے مدد کرتے ہیں۔ جو بھارت سے کسی طرح جان بچا کر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔
اس طرح امریکی کانگریس اور سینٹ میں ان کی رسائی ہے اور یہ کوئی موقعہ ایسا
نہیں چھوڑتے جب بھارت کے خلاف احتجاج سے چوک جائیں۔
ان کی کوششوں سے بھارت کے خلاف امریکی کانگریس اور سینٹ کئی قرار دادیں
پاس کر چکی ہے۔
بھارت میں سکھوں پر ہونے والے مظالم کی رپورٹیں شائع کرنا، ہیومن رائٹس
کو اس طرف متوجہ کرنا اور خالصتان تحریک کے لئے ہر ممکن وسائل مہیا کرنا اسی تنظیم
کی کارکردگی ہے۔
ان دنوں بھارت میں انتخابات ہوئے تھے اور پنجاب میں ۱۰۰ فیصد کامیابی ا
جماعتوں کو ملی تھیں جنہیں خالصتان نواز حلقوں کی حمایت حاصل تھی۔ ڈاکٹر گورچرا
سنگھ ڈھلوں پیشے کے لحاظ سے سائنسدان ہیں اور سیکرامنٹو میں رہتے ہیں وہ کمال شفقت

مظاہرہ کرتے ہوئے ملنے ٹریسی تشریف لائے تھے جہاں ان سے بات چیت ہوئی میرا
پہلا سوال بھی موجودہ صورت حال کے حوالے سے تھا۔
سوال۔ ڈاکٹر صاحب برصغیر کی تازہ صورتحال پر آپ کیا تبصرہ فرمائیں گے؟
جواب۔ برصغیر پاک و ہند پر جنگ کی جو فضا بھارتی سامراج نے مسلط کر رکھی
ہے۔ اس کا اندازہ عالمی سیاست پر نظر رکھنے والے ہر شخص کو پہلے ہی سے تھا۔ ہم ایک
رصے سے یہ بات کہتے آرہے ہیں کہ بھارتی حکومت چاہے جتنا بھی جھوٹ بولے وہ
بائی کو ہمیشہ کے لئے نہیں دبا سکتی۔ بھارت میں اقلیتوں خصوصاً سکھوں اور مسلمانوں
ے ساتھ جو ظلم و ستم ہو رہا ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ پہلے ہندو
کار نے یہ واویلا کیا کہ پنجاب میں مٹھی بھر تخریب کاروں نے صورتحال کو خراب کر
ھا اور حکومت جلد ہی ان پر قابو پا لے گی۔ آپ کو شائد یاد ہو کہ مسز اندرا گاندھی
نے ان تخریب کاروں کی تعداد دو اور ڈھائی سو کے درمیان بتائی تھی لیکن آپریشن بلیو
ر میں ہی ہزاروں سکھوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا گیا اور تب سے آج تک بھارتی
مت سکھوں کا قتل عام جاری رکھے ہوئے ہے لیکن یہ "تخریب کار" ختم ہونے میں
نہیں آرہے۔ اس دوران ایک اور شوشہ بھارتی حکومت کی طرف سے یہ چھوڑا گیا
خالصتان کا وجود صرف امریکہ، لندن، اور کینیڈا تک ہے لیکن آج ۱۹۹۰ء میں دنیا
، دیکھ لیا کہ اب تک ہماری لاکھ کوشش کے باوجود بھارتی حکومت نے کسی غیر
بدار بین الاقوامی کمیشن کو پنجاب میں جا کر تحقیق کرنے کی اجازت نہیں دی۔
اس کے باوجود بہت سی بین الاقوامی اور غیر جانبدار ایجنسیوں کی رپورٹیں ایمنسٹی
نیشنل کی رپورٹیں ایسی سامنے آئی ہیں جنہوں نے عالمی ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔
اہی میں لندن سے لیبر پارٹی کا جو وفد گیا تھا اس کے سربراہ مسٹر میکس میڈن کی
ٹ جو انہوں نے برطانوی دارالعوام کو پیش کی ہے نے بھارت کی موجودہ حکومت

کو بھی ننگا کر کے رکھ دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اب امریکن کانگریس اور سینٹ میں بھارتی
حکومت کے خلاف بل پیش ہو رہے ہیں اور ایسی رپورٹیں سامنے آنے لگی ہیں جنہوں
نے ہندوؤں کا اصل چہرہ دنیا کو دکھادیا ہے۔

جیسے "سافٹ ٹارگٹ" سامنے آئی ہے جس میں کینیڈا میں بھارتی سفارت خانے
کی غیر اخلاقی اور مجرمانہ حرکتوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اور قابل مصنفین نے ثابت کیا
ہے کہ کس طرح بھارتی حکومت نے اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لئے سکھوں کو
بدنام کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو حکومت کسی اقلیت کو بدنام
کرنے کے لئے اپنے ہی ملک کی ایئر لائن کو تباہ کر کے سینکڑوں بے گناہوں کی جان سے
کھیل سکتی ہو وہ اپنے مذموم مقاصد کی بجا آوری کے لئے کہاں تک گر سکتی ہے یہ کوئی
معمولی بات نہیں لیکن خدا جانے عالمی ضمیر کہاں سو گیا ہے کہ اسے کچھ دکھائی ہی نہیں
دے رہا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس حقیقت کے انکشاف پر یو این او میں بھارت کے خلاف
باقاعدہ کیس کیا جاتا اور اسے عالمی عدالت انصاف کے کٹہرے میں لا کر دنیا کے سامنے
کھڑا کیا جاتا لیکن آج کی دنیا مفادات کی دنیا ہے اور محض اپنے مفادات کے پیش نظر ہی
اچھائی اور برائی کا تعین کیا جاتا ہے۔

وی پی سنگھ سرکار جب برسر اقتدار آئی تو دنیا کو یہی تاثر دیا گیا کہ یہ مظلوموں
بڑی ہمدرد حکومت ہے لیکن اس کے برعکس جلد ہی ان کے جوہر کھل کر سامنے آ
ہیں۔ آج جس بہیمانہ طریق پر مقبوضہ کشمیر میں بے گناہ اور نہتے مسلمانوں کے خو
سے ہولی کھیلی جارہی ہے۔ اور تخریب کاری کی آڑ میں جس طرح پنجاب میں سکھوں
قتل عام ہو رہا ہے اس نے اس حکومت کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ یوں بھی
وی پی سنگھ اپنے عوام کی حمایت سے محروم ہونے لگے ہیں ان کے اپنے ساتھی
ایک کر کے انہیں چھوڑ رہے ہیں۔ بھارتی عوام غربت، بیماری، روزگار اور صحت

سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ ان مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے اور اپنے گناہوں پر
پردہ ڈالنے کے لئے ہندو سرکار کے پاس صرف ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ وہ پاکستان
پر مسلسل الزام تراشی کرتے ہوئے بالآخر جنگ چھیڑ دے۔

آج سے پہلے تو بھارتی حکومت نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ پاکستان سکھوں
کو ہتھیار اور ٹریننگ دے رہا ہے اب کشمیریوں نے اپنی آزادی کا نعرہ بلند کیا ہے تو ان
کے خلاف بھی اس الزام کی تکرار ہونے لگی ہے۔ شاید بھارت کے اندر چلنے والی
آزادی کی دیگر تحریکوں کا سلسلہ بھی ادھر ہی جوڑا جاتا لیکن بھارت کی بدقسمتی یہ ہوئی
کہ ان تحریکوں کے جو مراکز ہیں ان کی سرحدیں پاکستان نہیں ملتیں ورنہ ان میں بھی
پاکستان کا ہاتھ ہی نظر آتا۔

سوال۔ آپ کے خیال میں کیا بھارت پاکستان سے جنگ کرے گا؟ کیا اس کے بغیر
دونوں ممالک اپنے مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکتے؟

جواب۔ ہم نے پہلے ہی کہا ہے کہ پاکستان کا واسطہ ایسے دشمن سے ہے جس کے
نزدیک اصول یا اخلاقیات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ اپنے مذموم مقاصد کے لئے کچھ
بھی کر سکتا ہے۔ جنگ مسائل کا حل نہیں ہے۔ دونوں کو اپنے عوام کے مسائل پر توجہ
دینا چاہئے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ بھارت ہمیشہ کی طرح جنگ کی رٹ لگا رہا ہے اور
عین ممکن ہے کہ وہ ایسا کر گزرے۔

سوال۔ اس صورت میں آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟

جواب۔ ہماری جماعت کی پالیسی واضح ہے ہم نے دنیا بھر کے سکھوں سے اپیل کر
دی ہے کہ جنگ کی صورت میں وہ پاکستان کا ساتھ دیں ہمارا بھارت سے کوئی تعلق
نہیں نہ ہی اب سکھ قربانی کے بکرے بنیں گے۔ اگر بھارت نے پاکستان پر حملے کی
حماقت کی تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ بھارت کی اپنی سلامتی خطرے میں پڑ جائے

گی۔اور خالصہ فوجیں پاکستان کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لیں گی۔دنیا بھر میں موجود سکھ لیڈر شپ نے بھارت میں اور دنیا کے کونے کونے میں موجود اپنی قوم کے جوانوں کو یہ ہدایات جاری کر دی ہیں۔اس سلسلے میں ہمارے کوئی دوسری رائے نہیں ہے۔

ساری دنیا کے سامنے منتخب رکن قومی اسمبلی سردار سمرن جیت سنگھ مان نے اعلان کیا ہے کہ جنگ کی صورت میں سکھ بھارت کے بجائے پاکستان کا ساتھ دیں یہی ہمارا عہد ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ تاریخ کسی قوم کو بار بار سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیتی۔

سوال۔ سکھوں میں بے شمار اختلافات کے بعد یہ توقع کیسی کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی ایک مقصد یا مسئلے پر بھی متحد ہو جائیں گے؟

جواب۔ آپ کی بات ٹھیک ہے بظاہر بیرونی دنیا اور پنجاب میں سرگرم عمل خالصتانیوں میں گروپ بندی کا رجحان تقویت پکڑ رہا ہے اور ممکن ہے بھارتی انٹیلی جنس کے لوگ اس پر بہت خوش بھی ہوں کہ انہوں نے سکھوں کے درمیان اختلافات پیدا کر کے بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے ایک جماعت دو حصوں میں بٹ گئی ہو لیکن بھارتی انٹیلی جنس یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ ان میں کسی نے خالصتان مسئلے پر اپنا سٹینڈ بدل لیا ہو۔یہ ضرور ہوا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں بدگمانیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔آپ شیشے کے جتنے ٹکڑے کر لیں وہ شیشہ ہی رہے گا۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ہماری کامیابی ہے۔بھارتی حکومت سے ہمارا سوال یہ ہے کہ 84ء سے آج تک کیا وہ خالصتان کی حمایت کرنے والے کسی ایک سکھ کو بھی اپنا نقطہ نظر تبدیل کرنے پر آمادہ کر سکے ہیں؟سوائے ان لوگوں کے جنہیں ایک منصوبے کے تحت بھارتی انٹیلی جنس نے ہماری صفوں میں داخل کیا تھا اور جواب پہچان ہو جانے پر نکل چکے ہیں اور کوئی کامیاب انہیں حاصل نہیں ہوئی۔جب بھی کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس سے جذباتی طور پر بھی وابستہ ہو جاتے ہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ وقت کے ساتھ

ساتھ ان کے جذبات ٹھنڈے پڑنے لگتے ہیں اور بظاہر وہ گرم جوشی باقی نہیں رہتی اور دکھائی یہی دیتا ہے کہ جیسے تحریک کی حمایت میں کمی آنے لگی ہے۔لیکن آپ جانتے ہیں آزادی حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ہم جانتے ہیں کہ ہماری منزل دور ضرور ہے لیکن ہم اپنا آزاد وطن بہر صورت حاصل کر کے رہیں گے۔دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے کوئی قوم ایسی نہیں ملے گی جس نے اگر غلامی کا طوق گلے سے اتارنے کا تہیہ کر لیا ہو اور اسے آزادی نہ ملی ہو یہ دور آزادی کا دور ہے غلامی اپنی موت خود ہی مر رہی ہے۔مشرقی یورپ،افریقہ جہاں بھی دیکھ لیں لوگ آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ہمیں امید ہے کہ جلد ہی دنیا کو احساس ہو جائے گا کہ جنوب مغربی ایشیا کے اس سامراج سے بھی لوگ نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہماری مدد بھی کریں گے۔

امریکی سیاست میں دو سیاسی جماعتوں کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے جن میں سے ایک ری پبلکن اور دوسرے ڈیموکریٹس ہیں۔

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ری پبلکن پاکستان سے متعلق نرم گوشہ رکھتے ہیں جبکہ ڈیموکریٹس کا رویہ پاکستان کے تئیں اتنا بہتر نہیں جتنا وہ بھارت کی طرف ملتفت رہتے ہیں

اس صورت حال کا پس منظر کیا ہے؟

اس سوال کا جواب فوراً تو نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن----

ڈیموکریٹس کی طرف سے یہ استدلال ضرور پیش کیا جاتا ہے کہ وہ صرف جمہوری حکومتوں کو پسند کرتے ہیں جبکہ پاکستان اس معاملے میں بہت زیادہ خوش قسمت نہیں رہا۔ہمارے ہاں جمہوریت اول تو رو رو کر آتی ہے اور جب آجائے تو پھر جمہوریت نواز سیاستدان اس کی وہ مٹی پلید کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔

سوا اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ فوج دوبارہ زمام اقتدار سنبھال لے۔
ڈیموکریٹس کی طرف سے ری پبلکن پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ عموماً وہ تیسری دنیا کے ممالک میں ڈکٹیٹروں کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ ڈکٹیٹر اندر سے بہت کمزور ہوتے ہیں اور عموماً کسی نہ کسی غیر ملکی طاقت کا سہارا انہیں درکار رہتا ہے۔ اور امریکن ری پبلکن ایسے کمزور حکمرانوں کو بہت پسند کرتے ہیں تاکہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکیں یہی وجہ ہے کہ وہ ان کی حمایت کرتے ہیں۔ بات کچھ بھی رہی ہو لیکن میری رائے ذرا مختلف ہے کہ پاکستان کے معاملے میں امریکن رویہ ہمیشہ متعصب رہا ہے۔

امریکن پاکستان سے بھارت کے مقابلے میں ہمیشہ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔
جس کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس کی یوں تو بہت سی وجوہات ہوں گی۔ لیکن ایک اہم اور انتہائی قابل توجہ وجہ ہماری کمزور سفارتکاری ہے۔

افسوس وعدوں کے باوجود آج تک ہم بین الاقوامی سطح پر اپنا کیس بھی ڈھنگ سے پیش نہیں کرسکے۔

اب ہمارا ایٹمی مسئلہ ہی لے لیجئے۔

اس مسئلے پر پاکستان پھر امریکہ کے نزدیک معتوب ٹھہرا ہے ہماری فوجی اور اقتصادی امداد بند کردی جاتی ہے اور اس کے لئے کبھی کوئی ڈھنگ کا بہانہ بھی نہیں سوچا جاتا پاکستان کو برملا کہا جاتا ہے کہ یا تو اپنا پرامن ایٹمی پروگرام بند کردو یا ہماری امداد سے ہاتھ دھو رکھو۔

یہ ہے اس امریکی سوچ اور طرز فکر کا تانا بانا جس کے تحت یکم اکتوبر 1990ء سے ہمیں آئندہ سال ملنے والی ہر قسم کی امداد پر پابندی لگادی گئی ہے۔

جو بحری جہاز کچھ جنگی سامان کے پرزے لے کر روانہ ہو چکے تھے انہیں کھلے پانیوں سے واپس بلا لیا گیا ہے۔ پی ایل 480 کے تحت ملنے والی اشیاء کی ترسیل بھی روک دی گئی ہے۔ وہ عالمی امدادی ادارے جو امریکی سرپرستی میں کام کرتے ہیں یعنی ورلڈ بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ انہیں بھی ہاتھ روک دینے اور شرائط سخت تر کر دینے کا اشارہ ملا ہے۔

عالمی سطح پر ان تمام ممالک کو جو پاکستان کے معاملے میں امریکی پالیسیوں کا اتباع کرتے ہیں مشورہ دیا گیا ہے کہ اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ یہاں تک کہ پاکستان کے روایتی مسلمان دوستوں یعنی سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور کویت کی معزول حکومت جو بوجوہ ان دنوں عالمی امریکی پالیسیوں کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتے کو بھی ہماری جانب دست تعاون بڑھانے میں دقتیں پیش آرہی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوویت یونین کے خلاف تو امریکی سرد جنگ کا خاتمہ ہو گیا ہے لیکن اب پاکستان جیسا کمزور اور چھوٹا ملک اس شکنجے میں آیا ہے۔

پاکستان کا قصور اگر یہ ہے کہ اس نے ایٹمی میدان میں اس حد تک ترقی کرلی ہے کہ کسی وقت بھی پرزے جوڑ کر ایٹم بنالینا اس کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں اور تیسری دنیا کے کسی ملک کے پاس ایسی صلاحیت یا طاقت کا آجانا امریکہ کو گوارا نہیں تو پاکستان سے بہت پہلے یہ منزل بھارت، اسرائیل اور جنوبی افریقہ عبور کرچکے ہیں۔ بھارت کا ۱۹۷۴ء کا ایٹمی تجربہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے۔

اسرائیل کے بارے میں امریکی ماہرین اور ان امور پر نگاہ رکھنے والے اداروں کی رائے یہ ہے کہ وہ ایٹم نہیں ہائیڈروجن بم بنانے کی پوزیشن میں ہے اور جنوبی افریقہ کے بارے میں یہ بات ہر کسی کے علم میں ہے کہ اس نے اسرائیل کے تعاون سے کئی برس پہلے ایٹمی صلاحیت حاصل کرلی تھی۔ تو پھر صرف پاکستان ہی کو اس معاملے میں

"سنگل آؤٹ" کیوں کیا جا رہا ہے۔ روایتی طور پر پاکستان روز اول سے امریکہ کا حلیف اور دوست رہا ہے۔

ماضی میں اس نے کمیونزم کی یلغار کو روکنے کے لئے، سوویت ایمپائر کی وسعت کو روکنے کے لئے کئی امریکی مہمات میں اس کا ساتھ دیا ہے۔ چین امریکہ تعلقات کو دشمنی سے دوستی میں بدلنے کے لئے پاکستان کا کردار بنیادی تھا۔ پوری عرب دنیا اور مسلم بلاک میں جب بھی امریکہ مخالفت اپنے زوروں پر تھی امریکیوں کو پاکستان کے ساتھ دوستی کا فائدہ حاصل تھا۔

پاک امریکہ دوستی ہمیشہ یکطرفہ ٹریفک رہی ہے۔ اپنے محل و وقوع کے لحاظ سے ہمارا ملک جنوبی ایشیا کے مغرب میں واقع ہے۔ چین جیسے بڑے اور اہم ملک کا ہمسایہ ہے۔ مملکت روس کے جنوب میں اہم ترین غیر کمیونسٹ اور مسلم ملک ہے۔ عالم عرب کے دھانے پر کھڑا ہے۔

اس لحاظ سے اگر امریکہ کو کبھی اپنے عالمی اہداف کے حصول کے لئے پاکستان کی ضرورت پڑی ہے تو اس نے ہمیں فوجی اور اقتصادی امداد فراہم کی ہے۔ لیکن اگر پاکستان کو خالصتاً اپنے دفاع کی خاطر امریکی امداد یا تعاون کی ضرورت پڑی ہے تو امریکہ نے سرد مہری ہی نہیں دکھائی ہر موقع پر صریحاً انکار کیا ہے۔

۶۵ اور ۷۱ کی پاک بھارت جنگوں میں امریکی رویہ اور کردار اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ہمیں جب بھی امریکی امداد ملی ہے اس کا مقصد پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنانا اسے معاشی خود کفالت اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنا نہیں تھا بلکہ پاکستان کو امریکہ کے سب سے بڑے حریف سوویت یونین اور اس کے نظریئے کمیونزم کے خلاف جنوبی او مغربی ایشیا کی ڈھال کے طور پر استعمال کرنا تھا۔

سینٹو کے دفاعی معاہدے کا رکن ہمیں اس لئے بنایا گیا کہ مشرقی پاکستان کی وجہ سے

ارا ملک چین کی جانب سے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک پر کمیونزم کی یلغار کی روک ام کر سکتا تھا۔ پہلے معاہدہ بغداد اور پھر سینٹو کی رکنیت کے "شرف" ہمیں اس لئے شا گیا کہ پاکستان، ایران ترکی اور شروع میں عراق سب مل کر عالم عرب اور مسلم ک کے اندر اشتراکیت اور سوویت یونین کے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں بڑھتے ئے اثرات کی روک تھام کر سکتے تھے۔

ان حالات میں امریکی امداد جو ہمیں ملتی تھی ہماری دفاعی ضروریات کی خاطر نہیں تی تھی امریکہ مفادات کے تحفظ اور عالمی سطح پر امریکی اہداف کے حصول کے لئے تی تھی۔

امریکی حکام اور پالیسی سازوں کا ذہن اس بارے میں ہمیشہ یکسو رہا ہے۔ انہوں نے ی بھی پاکستان کو پاکستان کی خاطر مدد نہیں دی۔ اگر اس بارے میں غلط فہمی کا شکار ئے ہیں تو ہم ہوئے ہیں ہمارے پالیسی ساز ہوئے ہیں ہمارے حکمران اپنی اغراض اور فہمی کی بنا پر امریکی طرز فکر کو سمجھنے میں ناکام ہوئے ہیں۔ قصور اس میں امریکیوں کا ہ زیادہ نہیں ہمارا اپنا ہے۔ ہمارے حکمران طبقے کا ہے۔ جسے اقتدار پر براجمان رہنے لے لئے پاکستانی عوام سے زیادہ امریکی حکام کی خوشنودی اور رضامندی کی ضرورت ہوا تی تھی۔ ورنہ امریکیوں کے بارے میں کسی کو اگر غلط فہمی تھی تو وہ 1965ء میں دور جانی چاہئے تھی۔

1971ء میں جب ہمیں دولخت ہوتے دیکھ کر بھی امریکیوں کی "رگ دوستی" نہ ری تو ہمیں اس دوستی کی نوعیت بھانپ لینی چاہئے تھی۔ اس کے بعد بھی ہم اگر یہ قع کرتے ہیں کہ امریکہ محض ہماری خاطر، ہر طرح کے حالات میں ہماری مدد کرتا ہے تو اس بارے میں ہمیں امریکیوں کو مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے بحیثیت قوم پنے اجتماعی طرز فکر و عمل کے بارے میں غور کرنا چاہئے۔

○

امریکیوں کے یہاں دوستی کوئی پائیدار اور ہمیشہ کے لئے قائم اور بر قرار رہنے والی صفت نہیں ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں تو در حقیقت ان کا مغربی یورپ کے ممالک اور اسرائیل کے علاوہ کوئی دوست ہے ہی نہیں۔

عالمی سطح پر انہوں نے کبھی دوست بنانے کی فکر نہیں کی اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے ضرورت مند ملکوں کی تلاش کی ہے۔ جب تک یہ ممالک ان مفادات کی تکمیل میں ان کے کام آتے رہتے ہیں وہ ان پر اپنی نوازشات کی بارش کرتے رہتے ہیں۔ یہاں کے حکمرانوں کے اقتدار کو قطع نظر اس سے کہ انہوں نے فوجی وردی پہنی ہوتی ہے یا جمہوری لبادہ اوڑھا ہوتا ہے ہمیشہ تحفظ دیتے آئے ہیں۔

یہ مفادات جب پورے ہو جاتے ہیں تو امداد بھی بند اور اس ملک کے حکمران کے تحفظ کی ذمہ داری بھی ختم۔ اس کام کے لئے بہانہ تو ہر وقت کوئی نہ کوئی موجود ہی ہوتا ہے۔ 1965ء میں جب ہماری امداد پر پابندی لگائی گئی تھی تو اس وقت پاکستان کون سے "ایٹمی پروگرام" پر امریکیوں کی مرضی اور پالیسی کے خلاف عمل کر رہا تھا جو ہماری ہر طرح کی فوجی اور اقتصادی ضروریات کی ترسیل بند کر دی گئی تھی۔

1976---77ء میں پہلی مرتبہ ایٹمی پروگرام کے حوالے سے ہماری امداد رو گئی تھی۔ 1980ء میں اسی صدر کارٹر نے افغانستان پر سوویت فوجوں کی یلغار کے نتیج میں اپنے مفادات کو خطرے میں پایا تو چار سو ملین ڈالر کی پیشکش کر دی۔ مرحوم ض الحق نے موقع اور حالات کو بھانپتے ہوئے اتنی رقم کو "مونگ پھلی کے چند دانے" کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

امریکی مجبور ہوئے کہ 1981ء میں تین اعشاریہ دو ملین ڈالر کی فوجی اور اقتصا امداد سے ہمیں نوازیں۔ پھر 1987ء میں اتنی ہی مزید رقم بلکہ چار ملین ڈالر کا آئند

سالوں کے لئے اضافہ کریں 1988ء میں سوویت یونین فوجیں افغانستان کو خالی کر کے چلی گئیں۔

1990ء تک امریکہ سوویت دشمنی دوستی میں بدل گئی بقیہ رقم پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ "ایٹمی پروگرام" کا بہانہ تو موجود ہی تھا لہٰذا ہمارے امریکی سرپرستوں کو مزید عذر ڈھونڈنے کی حاجت پیش نہیں آئی۔ جن افغان مجاہدین کے جزبہ حریت کی امریکی اخبارات و رسائل اور وہائٹ ہاؤس کے افسران تعریف و توصیف کرتے نہیں تھکتے تھے وہ انہیں اب بنیاد پرست نظر آتے ہیں، گویا پہلے نہیں تھے اور جس پاکستان کی سلامتی کے تحفظ کو وہ اپنی خارجہ پالیسی کا "کارنر سٹون" قرار دیتے تھے، اس کی دفاعی ضروریات کے لئے بھیجے جانے والے فاضل پرزے لانے والے بحری جہازوں کو راستے ہی سے واپس بلا لیا گیا ہے۔

○

خارجہ پالیسی کے میدان میں امریکی پالیسی ساز منطق اور اصول کے نہیں تحکم کے قائل ہیں۔ امریکی قوم کے تحت الشعور میں جو سوچ پائی جاتی ہے اس کے تحت اس وقت کرہ ارض پر ان کی سپر طاقت کی "بادشاہت" قائم ہے۔ بادشاہت ہمیشہ اپنے مزاج اور طرز فکر و عمل کے لحاظ سے قوت اور دبدبے سے محکوم دنیا کو اپنی مرضی اور ارادوں کی تابع رکھنا چاہتی ہے۔ ان کا حوالہ وہ اس وقت دیتی ہے جب یہ اس کے ارادوں کی تکمیل میں اتفاقاً "گریس آئل" کا کام دیتے ہوں۔

اگر یہ ایسی کوئی خدمت سر انجام نہ دے سکتے ہوں تو وہ ان باتوں یا اصولوں کو ہر گز خاطر میں نہیں لاتی۔ ورنہ کیا معمولی سی حقیقت امریکی پالیسی سازوں کی سمجھ میں نہیں آئی کہ انہوں نے اس کو پوری دھائی میں افغانستان کے اندر اپنے مفادات کی خاطر پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے صرف نظر کیا۔ اسے آگے بڑھنے دیا۔

اس دوران پاکستانی فوج اور اقتصادی امداد کی ہمارے ایٹمی پروگرام کی راہ میں رکاوٹ سمنگٹن ترمیم کے اپنے قانون کو بالائے طاق رکھا۔ کانگریس کو مطمئن کرنے کی خاطر صدر امریکہ ہر سال پریسلر ترمیم کے تحت اس مضمون کا سرٹیفکیٹ جاری کرتے رہے کہ پاکستان کے پاس کوئی ایٹم بم نہیں ہے۔ اس دوران امریکی جاسوسی اداروں کی اطلاعات کے مطابق پاکستان اپنے پروگرام پر پوری طرح عمل پیرا رہا۔

امریکی حکام اس سے قطعی بے خبر نہیں تھے۔ بس ان کا مفاد یہ تقاضہ کرتا تھا اس سے صرف نظر کریں سو انہوں نے اسے خوستہ و نخواستہ آگے بڑھنے دیا۔ اب خود امریکی اطلاعات کے مطابق یہ اس نقطے کو چھو گیا ہے جہاں سے پاکستان آسانی کے ساتھ اور جب چاہے گا پرزے جوڑ کر ایٹم بم بنالے گا۔

اسے اس مقام تک پہنچانے میں امریکیوں نے گزشتہ دس سال تک بالواسطہ مدد دی ہے۔ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے اب جو ہمارا ایٹمی جن بوتل سے باہر نکل آیا ہے تو حکومت امریکہ کا ارشاد ہے کہ اسے واپس بھیجو۔ حضور کچھ تو عقل کے ناخن لیجئے کبھی ایسا بھی ہوا ہے۔ آپ پچاس کی دہائی میں روس کو ایٹم اور پھر ہائیڈروجن بم بنانے سے نہیں روک سکے تھے۔

ستر کی دہائی میں بھارت نے آپ کی ایک نہ سنی اور اب آپ پاکستان سے کیسے توقع رکھ رہے ہیں کہ وہ اپنے دفاع اور توانائی کی ضروریات کی خاطر اپنے ایٹمی پروگرام کو محض اس لئے ترک کردے کہ آپ جیسا ناقابل اعتبار اور وقت اور ضرورت پر کبھی کام نہ آنے والا دوست اس کا تقاضا کر رہا ہے۔

1986-87ء کے موسم سرما میں جب بھارت براس ٹیک کے جنگی منصوبے کے تحت ہم پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا اس وقت یہ ہمارا ایٹمی پروگرام ہی تھا جس کی وجہ سے بھارتی حکومت اپنے ہاتھ روکنے پر مجبور ہو گئی تھی ورنہ آپ نے

بھارتیوں کو اپنے قول و فعل کے ذریعے یہ ضمانت فراہم کر رکھی ہے کہ پاک بھارت جنگ کی صورت میں امریکہ پاکستان کی حمایت نہیں کرے گا اور غیر جانبدار رہے گا۔

○

ان حالات میں پاکستان کے پاس اپنے دفاع کی خاطر ایٹمی توانائی کے حصول کے علاوہ اور آخر کون سا طریقہ رہ جاتا ہے؟

شاید دنیا کو بھارت کی وہ "براس ٹیک" جنگی مشق نہیں بھولی ہو گی جب بھارتی فوج پاکستان کی سرحدوں پر جنگی مشقوں کی آڑ میں چڑھ آئی تھی تب بھارت کو اپنے خطرناک ارادے سے اگر کسی بات نے منع کیا تھا وہ پاکستان کا یہی ایٹمی پروگرام تھا۔ بھارتی صحافی کلدیپ نیر کے حوالے سے شائع ہونے والا پاکستان کے مایہ ناز سپوت ڈاکٹر خان کا انٹرویو جب بھارتی اخبارات میں چھپا اور ڈاکٹر خان کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی کہ اگر بھارت نے پاکستان پر جارحیت کی اور پاکستان کے پاس اور کوئی چارہ کار نہ رہا تو بادل نخواستہ وہ بھارت کے خلاف ایٹم بم ہی استعمال کرے گا۔

اس خبر کا چھپنا تھا کہ بھارت کو اپنے گھناؤنے منصوبے خاک میں ملتے دکھائی دیئے تو بھارتی فوج چھاؤنیوں میں واپس لوٹ گئی۔

اس بات کو دنیا کا ہر ذی شعور شخص جانتا ہے کہ مستقبل میں دنیا کو کوئی ملک اگر اس نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا تو وہ کبھی اپنے مخالفین کے خلاف ایٹم بم استعمال نہیں کرے گا۔

ایٹم بم ایک "ڈیٹرنٹ" ہے۔

اس کی موجودگی بھارت کو پاکستان پر حملے سے منع رکھے گی۔ کیونکہ بھارتی جانتے ہیں کہ پاکستان مجبور ہو کر ایٹم بم استعمال کرے گا اور دنیا کبھی یہ پسند نہیں کرے گی کہ دنیا کے کسی حصے میں ایٹم بم استعمال ہو اس لئے وہ بھارت پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ جنگ نہ کرے۔

○

یہی تھی وہ سوچ اور خیالات جن کے ساتھ میں نے امریکی ری پبلکن کی فارن
افیئر کمیٹی کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر لوسیئر سے ملاقات کی----

اس ملاقات کا اہتمام بھی سینٹ میں میرے ایک کرم فرمانے کیا تھا۔ ڈاکٹر لوسیئر
سینٹر جیسی ہیلمز کے دفاتر میں ہمارے منتظر تھے۔

سردار صاحب نے مجھے واشنگٹن کے یونین سٹیشن سے "وصول" کیا اور سیدھے
ادھر ہی لے آئے۔

امریکہ میں "کار پارکنگ" پر کمال بڑے کمال کی بات ہے اور سردار صاحب کو اس
پر مہارت تامہ حاصل ہے۔ کوئی نہ کوئی خالی گوشہ ان کی نظروں میں ہمیشہ رہتا ہے
جہاں وہ سمجھتے ہیں کہ کار پارکنگ کو جگہ مل جائے گی۔

گو کہ اس سے پہلے بھی سردار صاحب کی معیت میں متعدد مرتبہ میں کانگریس اور
سینٹ کے دفاتر دیکھ چکا تھا اور ایک بات جو میرے لئے آج تک پریشانی کا باعث رہی
ہے وہ ایک پاکستانی ہونے کے ناطے ہے۔

میرا خیال ہے امریکیوں کو اپنی سیکورٹی کی کوئی فکر نہیں۔

جی ہاں!

آپ بھی شاید میری بات سے متفق ہوں گے ہمارے ملک کے ایئرپورٹ دیکھ
جنگی قلعے نظر آتے ہیں۔

جہاز پر چڑھتے یا اترتے وقت دل کو یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر جہاز کو اپنے
محاصرے میں لئے ہماری ایئرپورٹ سیکورٹی کے شیر دل جوانوں میں سے کسی ایک کی
نلکی کا دباؤ ٹریگر پر ذرا سا بھی پڑ گیا تو ایک آدھ بندہ اپنی جان سے گیا----!!

ہمارے بہادر جوانوں نے جہاز کو اس طرح گھیرے میں لیا ہوتا ہے کہ یا تو اس میں
سے "دہشت گرد" برآمد ہونے والے ہیں۔ یا پھر سوار ہو رہے ہیں----!!

ایئرپورٹ میں داخلے سے جہاز میں سوار ہونے تک آپ کو اتنی مرتبہ تلاشی اور
"جامہ تلاشی" کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ خود پر خواہ مخواہ شک ہونے لگتا ہے کہ
آخر اتنے ذمہ دار سیکورٹی کے اہلکار اتنے بیوقوف نہیں کہ وہ بار بار ہمارے سامان پر
مہریں لگا رہے ہیں۔

کہیں کاغذ پر مہر چیک ہوتی ہے--- کہیں کاغذ کو پھاڑا جاتا ہے---ایک مشین پر
اعتبار نہیں دو مشینوں سے سامان گزر رہا ہے۔

بار بار آپ چیک ہو رہے ہیں۔

آخر کوئی بات تو ہے----

○

ایک مرتبہ تو ایسا منظر دکھائی دیا کہ سر پیٹ لینے کو جی چاہا----!!

لندن سے ایک پرواز پر میں اسلام آباد پہنچا تھا۔

پہلی مرتبہ تو آیا نہیں تھا اس لئے ہمارے سیکورٹی حکام کی یلغار کسی بھی پرواز پر
میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

میں جانتا تھا کہ یہ لوگ جو بین الاقوامی آمد کے سامنے ہاتھوں میں مختلف ناموں
کے پلے کارڈ پکڑے کھڑے ہیں اور ہر اترنے والے مسافر کی آنکھوں کے سامنے اسے
اس طرح لہراتے ہیں جس طرح گاڑی کی روانگی کے لئے گارڈ جھنڈی لہرایا کرتا ہے--

یہ سب لوگ مختلف ایجنسیوں کے "ہونہار ملازمین" ہیں جو اپنے اپنے "صاحب"
کے حکم پر ان کے مہمانوں کو "ریسیو" کرنے آئے ہیں---
خفیہ پولیس، کے ان اہلکاروں کی ہر ممکن یہ کوشش ہوتی ہے کہ یہاں موجود
مسافروں کو ان کی اہمیت کا علم ہو جائے۔

بے چارے اس کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔
کبھی آپ کے نزدیک آکر آپ کو گھوریں گے۔
کبھی خواہ مخواہ آپ کے سامان کے گرد چکر کاٹنے لگیں گے۔
کبھی آپ کے نزدیک سے خوامخواہ اس طرح گزریں گے کوئی ایسی حرکت کریں
گے کہ آپ متوجہ ہوں۔
کیونکہ جب تک ان بے چاروں کی "اہمیت" آپ نہیں جان پائیں گے ان کا دبدبہ
کیسے قائم ہوگا۔
"ٹوہر" کیسے بنے گی؟
اب ذرا مثال ملاحظہ کیجئے ایسے ہی ایک "صاحب بہادر" اپنا ٹوہر کس طرح دکھ
رہے تھے۔ جسے دیکھ کر بے اختیار میرا ہاتھ اپنے ماتھے سے ٹکرا گیا---
"صاحب بہادر" نے مخصوص انداز کی شلوار قمیص اور چپل پہن رکھی تھی او
"ریوالونگ بیلٹ" یعنی وہ بیلٹ جس پر مسافروں کا سامان جہاز سے اتار کر رکھا جاتا
اور وہ دائرہ میں چلتی ہے----
یہ صاحب بہادر اس بیلٹ کے سنٹر پوائنٹ پر کھڑے تھے----!!
بیلٹ کے درمیان خالی جگہ کھڑے ہو کر کبھی وہ مسافروں کو عجیب سی نظروں۔
دیکھنے لگتے اور کبھی اس سامان کو جو اس پر چل رہا تھا----
کبھی کبھی موج میں آتے تو درمیانی خالی جگہ پر چہل قدمی فرمانے لگتے---

یہ برٹش ایرویز کی پرواز تھی جس سے غیر ملکیوں کا ایک ٹولا بھی شاید اپنے سفارتی
ائض سنبھالنے آیا تھا۔
خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ میں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے ان غیر ملکیوں کو ان
ماحب بہادر" کی ایسی محیر العقول حرکات پر پہلے مسکراتے پھر قہقہے لگاتے بھی دیکھا
---!!

خدا جانے سیکورٹی کا یہ کون سا انداز تھا۔

○

امریکن بڑے بے وقوف ہیں----
نہ تو انہیں اپنے جہازوں کی فکر ہے----
نہ اپنے حساس نوعیت کے مقامات کی----
نہ ہی اس بات کی پروا کہ اگر انہوں نے رن وے پر کھڑے جہازوں کو مسلح
رے میں نہ لیا تو انہیں بم سے اڑا دیا جائے گا----
اب یہی دیکھ لیجئے----
خاکسار امریکہ کے ایک سے دوسرے کونے تک متعدد مرتبہ امریکہ کی قریباً
ت مختلف ائرلائنوں میں سفر کر چکا ہے۔
لیکن----
ایسے بے وقوف لوگ ہیں کہ آج تک "ٹھونک بجا" کر میری تلاشی نہیں لی۔
حب میری بات ہی کیا--- میری آنکھوں کے سامنے گزرتے سینکڑوں مسافروں
ہانے دیا۔
کیا مجال جو اس کے جسم کو کسی نے انگلی لگا کر بھی دیکھا ہو----
صرف ایک مرتبہ سیاٹل کے ہوائی اڈے پر ایک کالی میم نے مجھے کہا کہ لوہے کی

تمام چیزیں اس کے نزدیک رکھے پیالے میں ڈال کر اس دروازے سے گزر جاؤں---

ایک مرتبہ "میامی" ایئرپورٹ پر ایک گورے صاحب نے مجھ سے درخواست کی کہ اپنے ہاتھ بغلوں سے ذرا بلند کر کے اس راستے سے گزروں درخواست جس ملتجی انداز میں کی گئی تھی اس کا اندازہ شاید آپ کبھی نہ لگا سکیں۔

خوامخواہ حیران رہنے کو جی چاہتا تھا۔

آج تک کسی نے ایک سے زیادہ مرتبہ "بورڈنگ کارڈ" نہیں دیکھا---

دوسری مرتبہ بیگ نہیں کھلوایا---

کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں کوئی مشتبہ یا دہشت گرد ہوں۔ کبھی کسی ٹنشن یا عزت نفس کے مجروح ہونے کا احساس نہیں ہوا۔

یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ امریکیوں کو سیکورٹی کا علم ہی نہیں---

اس ضمن میں ایک لطیفہ یاد آتا ہے تو اپنی بے وقوفی یا سادہ لوحی کہہ لیجئے پر آج بھی ہنس دیتا ہوں۔

جب میں پہلی مرتبہ سینٹ میں گیا تو داخلے کے دروازے سے اندر آنے پر ایک سائفر مشین لگی ہے۔ جس پر آپ کے ہمراہ جانے والا سامان گزارا جاتا ہے۔

میرے پاس ایک کیمرہ اور ایک ٹیپ ریکارڈر تھا---

اب ہمیں عادت تھی اپنے ملک کی---کہ صاحب کیمرہ اپنے پاس رکھئے لیکن اس کے سیل "چیک ان سامان" میں رکھئے---اس بات کی سمجھ آج تک نہیں آسکی کہ سیل مسافر کے ہینڈ بیگیج میں تباہ کن ثابت ہوتے ہیں وہ "چیک ان بیگج" میں پہنچ خطرناک کیوں نہیں رہتے۔

میں نے سیل نکالے اور مشین کے سرہانے کھڑے "کالے صاحب" کو تھماد

وہ خدا کا بندہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔

اس دوران میرے ہمراہی بھی مسکراتے رہے۔

یا میری بدحواسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے---

کالے صاحب، نے دونوں سیل پکڑے میرا شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر لوٹا دیئے کہ نہیں ضرورت نہیں۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے سیل تھام لئے اور یہی جانا کہ شاید میں اپنی بات سمجھا نہیں پایا۔

ہماری انگریزی ذرا ایسی ہی ہے----

اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ کیمرے سے تو سیل نکالے نہیں----!

ارے یہ کیا غضب ہو گیا---دل نے کہا---لو بیٹا اب تو پھنس گئے۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت (Superpower) کا سینٹ ہے اور تم ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے جا رہے ہو۔

میں نے سردار کی طرف دیکھا اور کہا۔

"سردار صاحب انہاں نوں میری انگریزی شاید سمجھ نہیں آئی۔ ذرا دس دینا کہ ہمرے وچ وی سیل موجود نیں"----

اس نے میری بات کا ترجمہ سنجیدگی سے انگریزی میں کیا اور یک لخت دونوں سیکورٹی گارڈ اور سردار صاحب قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

میں ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگا----!!

سردار صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"مہاراج بھاویں بم لے جاؤ----پرواہ نہ کرو---ایہہ سرداراں تے پروہنیاں ل کجھ نہیں آکھدے"----

اب بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے اور میں بھی مسکرا دیا---

دراصل "اعتماد" ہی کسی قوم کی عظمت پر دلالت کرتا ہے---

اور اعتماد اس قوم کے افراد کو حاصل ہوتا ہے جہاں "نظام" مضبوط بنیادوں پر

استوار ہوں۔

جہاں فرد کو اطمینان ہو کہ کوئی اس کے سر پر لٹھ لے کر نہیں کھڑا۔ اگر وہ غلطی

کرے گا تو اسی کا نقصان ہوگا۔ کیونکہ یہ زمین۔ یہ ملک اس کا ہے۔ اور وہ اتنا ہی ذمہ دار

اور محبِّ وطن ہے جتنے اس ملک کے حکمران۔

بدقسمتی سے ہم اعتماد کی دولت سے محروم ہیں۔

بے اعتمادی ہمارے سسٹم کی بنیاد ہے----

ہم ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں----

اور اس شک کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔

بے بنیاد شکوک ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکے ہیں۔ اور یہ کوئی صحت مند

رویہ نہیں۔

بے بنیاد شکوک بے اطمینانی کا باعث بنتے ہیں اور انسان کو ذہنی مریض بنا کر رکھ

دیتے ہیں۔

ہم ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کو تیار ہی نہیں----!!

کوئی شخص اگر با رسوخ ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس پر کسی مرحلے پر کوئی

"چیک" نہیں۔

لیکن----

عام پاکستانی "قابل اعتبار" نہیں----

ہر محکمے کا اہلکار اسے شک کی نظروں سے دیکھتا ہے----

ہم نے اپنے اداروں کے نصاب نہ بدلے----

انہیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا----

اہلکاروں کی ذہنیت نہ بدلی----

تو پھر خدا ہی ہمارا حافظ ہے----

○

ڈاکٹر لوسیئر سے میں نے پہلا سوال پاکستان کی ایٹمی پالیسی کے حوالے سے کیا اور
پوچھا تھا کہ آخر وہ اس بات پر اعتبار کیوں نہیں کرتے کہ ہمارا ایٹمی پروگرام پرامن ہے
ور کوئی خطرناک عزائم نہیں رکھتے۔

اس کے برعکس ہمارے ہمسائے نے نہ صرف ایٹمی دھماکہ کیا بلکہ مسلسل اس
مت میں آگے بڑھ رہا ہے اور نیوکلیئر اسلحے کے ڈھیر لگاتا چلا جا رہا ہے---اور وہ آپ
کے نزدیک پھر بھی "معصوم" ہے۔

ڈاکٹر لوسیئر نے مسکراتے ہوئے فوم کا کپ میری طرف بڑھایا۔ یہ چائے انہوں
نے خود تیار کی تھی کیونکہ امریکہ میں چپراسی نہیں ہوتے۔ یہ "اعزاز" بھی ہمیں ہی
اصل ہے کہ دفتر کے باہر جب تک چپراسی نہ بیٹھا ہو ہم خود کو افسر سمجھنے کو تیار ہی
ہیں ہوتے۔

"اس غلط فہمی کا ازالہ کر لیجئے کہ ہم نے کبھی بھارت کے ایٹمی پروگرام کی حمایت
یں کی نہ ہی اسے پسند کیا ہے۔ لیکن ابھی تک ہمیں اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ
ارت نے ایٹم بم تیار بھی کر لئے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہماری خارجہ
یسی واضح ہے۔ ہم پاکستان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ہر کام کا ایک
ریق کار ہے جس سے ہمارے دوست بھی مبرا نہیں---پاکستان "پریسلر ترمیم" کی

زد میں آتا ہے اور کسی بھی ملک کے ایٹمی پروگرام کو ناپنے کا ہمارے پاس یہی پیمانہ ہے۔
جو ملک پریسلر ترمیم کی زد میں آئے۔ ہماری حکومت اس کی امداد روک دیتی ہے۔

تو آپ کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے افغانستان سے روسی فوجیوں کے نکلنے کے بع
کہ ---- میں نے سوال ادھورا چھوڑ کر ڈاکٹر لوسیئر کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں" انہوں نے اعتماد سے کہا --- "ہم ایک سسٹم کے تحت کام کرتے ہیں
اور ہمیں اپنے سسٹم پر اعتماد بھی ہے۔"

ڈاکٹر لوسیئر ! آپ کے خیال میں مقبوضہ کشمیر میں بھارت کا کردار کیا مہذب د
کے لئے چیلنج نہیں بن رہا؟ میں اگلا سوال کرتا ہوں۔

"ہاں! ہم ری پبلکن بھارت کے سری نگر میں کردار کو پسند نہیں کرتے سینیٹر جے
ہیلمز اس ضمن میں سینٹ میں کئی دفعہ تقاریر بھی کر چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دونو
ممالک نے شملہ سمجھوتے میں یہ بات طے کی ہے کہ اس مسئلے کو باہم افہام و تفہیم
حل کر لیں گے ---- انہیں ایسا کرنا چاہئے ----

آپ نے حال ہی میں کویت میں دوسرا طرز عمل اختیار کیا ہے اور عراق
غاصبانہ قبضے کے خلاف وہاں فوجیں اتار کر کویت کو آزاد کروا دیا ہے --- کیا بھا
بھی اسی سلوک کا مستحق نہیں ٹھہرتا؟

میں نے اپنی دانست میں ڈاکٹر کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا لیکن وہ اطمینان
چائے کا گھونٹ حلق میں انڈیل کر میری طرف متوجہ ہوئے۔

نہیں ---- آپ کویت کی مثال یہاں منطبق نہیں کر سکتے۔ کشمیر کی ح
متنازعہ ضرور ہے لیکن وہ کسی آزاد ملک کا نام نہیں نہ ہی کسی ملک نے اس پر غاصبانہ
کیا ہے۔ ری پبلکن کے نزدیک اس مسئلے کا حل استصواب رائے ہے۔ جو کشمیریوں
ہے ہم اس سلسلے میں اپنے فرائض سے غافل نہیں ہیں۔

ڈاکٹر لوسیئر سے دو گھنٹے تک گپ شپ چلتی رہی ---

میں نے محسوس کیا کہ وہ پاکستان کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن امریکن کتنے
ی آزاد خیال سہی۔ بین الاقوامی معاملات میں کبھی اپنی حکومت کے نقطہ نظر سے
خلاف نہیں کریں گے۔

یہ اعزاز بھی خدا کے فضل سے ہمیں ہی حاصل ہے کہ ایک برسر اقتدار جماعت
کے وزیر موصوف جو اس پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر سریر آرائے سلطنت ہوتے
ہیں اپنی ہی حکومت کی پالیسیوں میں پریس کے سامنے کیڑے نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔

امریکن کانگریس اور سینٹ کے ہر باشعور رکن کو علم ہے کہ بھارت ناانصافی کر رہا
ہے لیکن اس سلسلے میں امریکن انصاف کے تقاضوں کی پاسداری کرتے نظر نہیں آتے
یونکہ ابھی ان کا مفاد اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ وہ بھارت کو مجبور کر کے ہمارے
شمیری بھائیوں کو ان کا حق خود ارادیت واپس دلوانے میں مدد کرے۔ لہٰذا ہمیں اپنی
فاظت خود کرنا ہو گی۔ اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لئے بھی جو کچھ بن پائے وہ بھی
خود ہی کرنا پڑے گا۔

بھارتی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی اپنے وسائل اور بل بوتے پر خود ہی
تیار رہنا ہو گا اور اس کے ساتھ امریکی امداد کو خاطر میں لائے بغیر اقتصادی خود کفالت
کی منزل کو بھی پانا ہو گا۔

اس مقصد کی خاطر پہلا کام ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ قبل اس کے کہ امریکی فوجی و
اقتصادی امداد کی بندش کے علاوہ ہمارے خلاف کوئی اور قدم اٹھانے کی سوچے ہمیں
ایٹمی دھماکہ کرنے کا اعلان کر دینا چاہئے اور پوری دنیا کو یہ خبر دینی چاہئے کہ ہمارے
پاس ایٹم بم موجود ہے۔

ہم جنوبی ایشیا کی دوسری ایٹمی طاقت ہیں۔ ہم ایک ذمہ دار باعزت اور خوددار قوم

ہیں اس ایٹم بم کو محض اس وقت استعمال میں لائیں گے جب ہماری قومی سلامتی بالکل خطرے میں پڑ جائے گی۔

کوئی طاقتور ملک ہم پر بلا جواز حملہ کر دے گا۔ ہم اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود روایتی اسلحے اور فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے تو اپنی زندگی بچانے اپنے ملک کی سلامتی کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ہمارے پاس آخری چارہ کار کے طور پر رہے گا۔

امریکیوں کو بہت نزدیک سے دیکھنے کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ اس جرات مندانہ فیصلے کے بعد ہم پر کوئی عذاب آن پڑے گا--- آپ یقین جانئے مذہب دنیا صرف طاقت کی زبان ہی سمجھی ہے---!!!

ڈاکٹر ہیرالڈ ہڈسن چینز کا شمار امریکی دانشوروں کی صف اول میں ہوتا ہے اس کی ایک وجہ شاید ان کا شہرہ آفاق ٹی وی سلسلہ "ہیرلڈ ہڈسن چینز سے بات چیت" ہے ڈاکٹر صاحب 1972ء سے امریکن ٹی وی سے وابستہ ہیں اور دنیا کی قریباً تیرہ سو منتخب شخصیات جن کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے ہے کا انٹرویو کر چکے ہیں۔ جس شخصیت کو ڈاکٹر انٹرویو کے لئے منتخب کرتے ہیں اس کی شخصیت، علمی استعداد اور کارہائے نمایاں سے متعلق پوری تحقیق کی ذمہ داری بھی اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی منتخب کردہ شخصیات کے انٹرویوز امریکی عوام میں علمی سطح پر خاصی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر چینز کی شخصیت یوں تو ہمہ پہلو ہے اور زندگی کے بہت سے موضوعات پر انہیں ملکہ حاصل ہے لیکن عالم اسلام سے متعلق خصوصاً ان کے پاس ایک نرم گوشہ موجود ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ اسرائیل کی خوشنودی کے لئے جس طرح عالم اسلام سے اپنے تعلقات کشیدہ کر رہا ہے وہ غلط پالیسی ہے۔ ڈاکٹر چینز کی تین کتابیں دنیا میں ممتاز مقام رکھتی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

1- Who's who in Entertainment.

2- Who's who in the East.

3- Who's who in the World.

سوال۔ ڈاکٹر چینز سب سے پہلے آپ سے تعارف کروانے اور اپنے چینل سے متعلق کچھ بتانے کی درخواست کروں گا؟

جواب۔ جہاں تک میرا تعلیمی پس منظر ہے میں نے جارجیا یونیورسٹی سے جغرافیہ میں پی، ایچ۔ ڈی کی میرا موضوع جنوبی امریکہ کا ایک ملک بولیویا تھا۔ میں نے 1972ء سے ٹی وی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا جو ہفتہ میں ایک بار "ہیرالڈ چینز سے بات چیت" کے عنوان سے آج تک مسلسل نشر ہو رہا ہے میں نے آج تک قریباً تیرہ سو دنیا کی معروف ترین شخصیات سے انٹرویوز کئے ہیں۔ ان میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل ہیں۔

سوال۔ آپ نے جو انٹرویوز کا یہ سلسلہ شروع کیا اس کے پس پردہ مقصد کیا تھا؟

جواب۔ بنیادی مقصد تو یہ تھا کہ ٹیلی کمیونیکیشن کی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکی عوام کو باہر کی دنیا کے اکابرین سے متعارف کروایا جائے ان کے خیالات و افکار ہمارے عوام تک پہنچیں تاکہ ہم عمومی سطح سے اٹھ کر ایک بہتر اور فعال معاشرے کی تعمیر کے لئے کوشاں ہو سکیں جو ہم سے زیادہ بہتر اور منصفانہ بنیادوں پر قائم ہو۔

سوال۔ یہ تجربہ کیسا رہا؟

جواب۔ بہت شاندار اس سے میرے علم میں اضافہ ہوا اور علمی سطح پر بڑی طاقتوں کے باہمی تعلقات اور امریکہ کے دیگر ممالک سے تعلقات میں کارفرما محرکات کی نشاندہی بھی ہوئی۔ اسی درمیان مشرق وسطیٰ کے سیاسی حالات میں میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی خصوصاً جب ریگن دور حکومت میں لیبیا پر میرے ملک امریکہ نے بمباری کی تو مجھے احساس ہوا کہ امریکہ میں ایک مخصوص لابی نے کس طرح عرب ممالک اور عالم اسلام خاص طور پر لیبیا کے خلاف بے بنیاد تعصبات کو ہوا دے معاملے کو اتنا سنگین بنا رکھا ہے۔

سوال۔ اس پر آپ کا ردعمل ایک سکالر کی حیثیت سے کیا تھا؟

جواب۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں نے واقعات کی نوعیت کو پرکھا جانچا اور مجھے احساس ہوا کہ عالم اسلام کے خلاف امریکہ میں ایک مخصوص فضا پیدا کر کے نفرت کو ہوا دی جا رہی ہے اس کے بعد سے میری خصوصی توجہ مسلم مغرب تعلقات پر رہی کہ آخر مسلم دنیا سے مغرب کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟

ہم مسلمانوں کے متعلق کتنا علم رکھتے ہیں؟ کیا جانتے ہیں اور جو ہم جانتے ہیں وہ کس حد تک درست ہے اور یہ کہ مزید کیا کچھ جاننے کی ضرورت ہے مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے دیجئے کہ مغربی دنیا جس میں امریکہ بھی شامل ہے کی عالم اسلام کے متعلق معلومات محدود اور ناکافی ہیں مغربی عوام کی ایجوکیشن کے لئے میں نے مسلم مشاہیر سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا لیکن ابھی تک مجھے اپنے مقصد میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور بہت کچھ کرنا ابھی باقی ہے۔ جس کے لئے میں دن رات کوشاں رہتا ہوں۔ میرے خیال سے مغربی دنیا کو یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ انہیں عالم اسلام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اور اس ضمن میں مزید محنت کرنے کی ضرورت ہے آپ یوں کہہ لیجئے کہ میری فارمل تعلیم تو 63ء میں جب میں نے ڈاکٹریٹ کی ختم ہو گئی تھی لیکن میری ان فارمل تعلیم ابھی تک جاری ہے خاص طور پر مسلمانوں سے متعلق اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک میری معلومات محدود ہیں۔

سوال۔ عالم اسلام کے بیشتر مشاہیر سے انٹرویو کرنے کے بعد آپ کس اندازے پر پہنچے ہیں۔ آپ کے خیال میں امریکہ اور مسلم دنیا کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟

جواب۔ میری غیر جانبدارانہ رائے یہ ہے کہ مسلم دنیا کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں آپ یوں کہہ لیجئے کہ اتنے اچھے نہیں ہیں جتنے انہیں ہونا چاہئے اور یہاں مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ اس صورتحال کی ذمہ داری

بھی امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔

سوال۔ آپ کے خیال میں اس کی وجوہات کیا ہے؟

جواب۔ سب سے بڑی وجہ تو امریکہ کی حد سے بڑھتی ہوئی صیہونیت نوازی اور اسرائیل کی فلسطینیوں کے خلاف بے جا امداد ہے۔ یہاں میں وضاحت کرتا چلوں کہ میں یہودیت کو صیہونیت سے الگ خیال کرتا ہوں۔ اور یہ صیہونیت پروری ہمارے قومی مفادات اور روحانی ورثے سے براہ راست متصادم ہے۔ اس پالیسی کی وجہ سے امریکہ کو میں راہ گم کردہ شمار کرتا ہوں۔ یہ اسرائیل کی صیہونی لیڈر شپ کا اثر ہے کہ ہم کوئی بامقصد منصفانہ پالیسی مشرق وسطی میں اختیار نہیں کر سکے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سوچیں آخر ہم کس مقصد کے لئے اسرائیل کو اتنی امداد دے رہے ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ اس پالیسی کی وجہ سے کہیں ہم مشرق وسطی میں اپنے دوستوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ ہمارے اعلیٰ ایوانوں میں اسرائیل نواز لابی موجود ہے جو ہمہ وقت اسرائیل کی خوشہ چینی میں لگی رہتی ہے۔

سوال۔ ڈاکٹر چیر آپ نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ امریکہ کی حد سے بڑھ ہوئی صیہونیت نوازی کی وجہ سے اسلامی دنیا سے امریکہ کے تعلقات بڑی حد تک متا ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں آپ امریکہ کو کیا مشورہ دیں گے کیونکہ مسلمان ا امریکی صیہونی ریاست کے قیام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے؟

جواب۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف صیہونیت نوازی ہی مسلمانوں کے سا تعلقات میں حائل ہے۔ میرا استدلال یہ ہے کہ دیگر اسباب کے علاوہ یہ بھی ایک سبب ہے میرے خیال سے اچھے تعلقات نہ ہونے کی ایک وجہ ایک دوسرے کے ن نظر میں اختلاف ہے۔ مغرب کا نقطہ نظر سیکولر ہے جبکہ مسلم دنیا روحانی اقدار کی ح ہے مغرب کو بھی روحانی اقدار سے استفادہ کرنا چاہئے۔ دیکھیں ہم امریکہ میں رو

اقدار کی عدم موجودگی کی وجہ سے ابتری کا شکار ہیں۔ ہمارے پاس مادی اسباب کی کمی نہیں لیکن روحانی طور پر ہم کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اپنی روحانی اقدار سے وابستہ رہنا چاہئے۔ امریکہ کا المیہ یہ بھی ہے کہ اس کا تعلیمی سسٹم مسلم اقدار کو سمجھنے میں ناکام رہا ہے اور مسلمانوں کے خلاف تعصبات کو ختم نہیں کر سکا۔ میری امریکی عوام سے اپیل ہے کہ مسلمانوں کے خلاف متعصبانہ رویہ ختم کر دیں۔ اپنا نقطہ نظر تبدیل کریں اپنی ذات کی اکائی ہی میں گم نہ رہیں اور ”زینو فوبک“ نہ بنیں۔ میں کچھ نہ سیکھنے کی ذمہ داری امریکن پر عائد کرتا ہوں۔ مسلمان ایک بلین کے قریب ہیں جو ایک بڑی اکائی بنتی ہے اس لئے میری کوشش یہ ہے کہ میں امریکنوں کو ایجوکیٹ کروں اس مقصد کے حصول کے لئے مسلم مشاہیر کو ٹی وی پر لاتا ہوں تاکہ وہ مسلم دنیا کے متعلق بے خبر امریکیوں کو بتائیں۔

سوال۔ آپ نے کرنل قذافی اور یاسر عرفات سے بھی تفصیلی انٹرویو کئے ہیں ان دونوں شخصیات کے متعلق مسلم اور غیر مسلم دنیا میں مختلف رائے پائی جاتی ہے۔ آپ نے انہیں کیسا پایا؟

جواب۔ میں دونوں سے کچھ زیادہ شناسائی کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ میں نے یاسر عرفات سے آدھ گھنٹے کا انٹرویو نشر کیا ہے۔ میں نے اسے بہت ہمہ گیر انسان پایا وہ مقناطیسی شخصیت کا مالک ہے اور مخاطب کو اپنی شخصیت کے سحر میں جکڑے رکھنے کے فن سے آگاہ بھی ہے اس نے مجھے تحفے میں ایک سٹیچو دیا تھا جو سامنے میز پر رکھا ہے اور میری تصویر بھی اس کے ساتھ ہے۔

مجھے لیبیا میں تین مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ میں کرنل قذافی کی آئیڈیالوجی سے بہت متاثر ہوں۔ آخری مرتبہ میں گزشتہ سال اس سے ملا تھا جب لیبیا نے ہیومن رائٹس پر کانفرنس بلائی تھی۔ میں نے قذافی کی گرین بک پڑھی ہے اور لیبیا کی تاریخ

سے بھی واقف ہوں۔ 1950ء میں وہ غریب ترین قوم تھی مگر آج وہ دنیا میں معاشی
استحکام کے لئے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ انہیں تعلیم اور صحت کی مفت سہولیات
حاصل ہیں روزگار کے وافر ذرائع مہیا ہیں اور وہ خوشحال ہیں کرنل قذافی کا کہنا ہے کہ
یہ سب کچھ عوام کا حق ہے ان پر کوئی احسان نہیں۔ اور میں اس کی اس سوچ سے بہت
متاثر ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق قذافی اپنے عوام میں بہت مقبول ہے۔ اس
نے اپنے ملک میں ایسا نظام رائج کر رکھا ہے کہ وہاں کے عوام امور مملکت میں براہ
راست حصہ دار بنتے ہیں اور یہ بہت اچھا اقدام ہے۔ مجھے قذافی کے بہت سے
پروگراموں نے متاثر کیا ہے میرے خیال سے دنیا میں اب مزدور کو پارٹنر ہونا چاہئے
میں خیال کرتا ہوں کہ وقت آگیا ہے جب اس نقطہ نظر کو دیگر ممالک بھی اپنائیں
بشمول امریکہ کے کیونکہ امریکہ میں ''اونرشپ'' بہت کم افراد تک محدود ہے۔

میں نے حال ہی میں دنیا کے بڑے اکانومسٹ کا انٹرویو کیا ہے جس کا کہنا ہے کہ
امریکہ کے 40 فیصد اثاثوں پر ایک فیصد افراد قابض ہیں گوکہ قذافی کمیونسٹ نہیں ہے
لیکن وہ سرمایہ دارانہ نظام کو منصفانہ نظام تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس کے قریبی لوگوں
سے ملا ہوں وہ سب لائق اور فعال ہیں میں پھر اس سے ملنے کا متمنی ہوں کیونکہ وہ فوجی
فلسفہ تاریخ کو تسلیم نہیں کرتا اب سوشلزم کے زوال کی وجہ سے فوجی معیشت بھی
زوال پذیر ہوگی۔ جاپن کے سٹاک ایکسچینج کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ امریکی خسارے کے
بجٹ کا شکار ہیں۔ آپ کو نیویارک میں بے گھر لوگ ملیں گے۔

یہ دونوں لیڈر میرے لئے بہت دلچسپی کا باعث تھے اور میں ان سے حقیقی معنوں
میں متاثر ہوا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم آدھا فلسطین ضرور فلسطینیوں کو مل
جائے۔ یاسر عرفات کا راستہ بہت کٹھن ہے صیہونیوں کے تمام مطالبات تسلیم کر لی
کے باوجود ابھی تک اسے صیہونیوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

سوال۔ ڈاکٹر چینر مسلم دنیا اور امریکہ کے معاشی تعلقات پر آپ کیا تبصرہ فرمائیں
ئے۔ کیا عام امریکی شہری کو اس بات کا احساس ہے کہ صیہونیت پروری کی امریکہ کو
نی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے اسرائیل کی خوشنودی کے لئے امریکہ نے لیبیا سے
ںلقات منقطع کئے تو نقصان کس کا ہوا۔ اٹلی والے لیبیا سے چار ملین ڈالر کی تجارت
ِتے ہیں۔ امریکہ نے اسرائیل کو خوش رکھنے کے لئے سعودی عرب کو فوجی سامان
ینے سے انکار کیا تو نقصان کس نے اٹھایا؟ 34 بلین ڈالر کا سودا برطانیہ سے طے پا گیا۔
ں دور میں جب امریکی معیشت کو بڑے خطرات کا سامنا ہے امریکی ایوان نمائندگان
س طرح امریکی مفادات کو محض اسرائیل نوازی کی بھینٹ چڑھا رہا ہے؟

دراصل پرو اسرائیل لابی کی گرفت کانگریس اور سینٹ پر بہت مضبوط ہے
نگریس مین اسرائیل کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں اس طرح
پنی ممبر شپ ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں لیکن اب امریکی عوام کو اپنا زاویہ فکر بدلنا ہوگا
ِراگر آج امریکی ایوان نمائندگان نے صورتحال کی نزاکت کو نہ سمجھا تو مستقبل میں
ںاید ہمیں اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے۔

ڈاکٹر چینر کی سوچ انفرادی نہیں۔ امریکہ کے حقیقت پسند انٹیلکچوئیل ایسی ہی سوچ
کے مالک ہیں۔ مجھے بہت سے امریکن پروفیسروں، ڈاکٹروں، ماہرین معیشت و
عاشرت سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ لوگ اگر اسرائیل سے نفرت نہیں کرتے تو یہ بھی
نہیں چاہتے کہ امریکہ اسرائیل نوازی میں اتنا آگے نکل جائے تو اس کی معیشت ہی کو
نطرات لاحق ہونے لگیں۔

○

ڈاکٹر چینر سے انٹرویو میری زندگی کا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ اس انٹرویو میں
سلمان محقق پروفیسر جعفر حسین سید نے میری معاونت کی اور ان کی مدد سے ہی مجھے

اس شہرہ آفاق شخصیت تک رسائی میسر آئی۔ جعفر حسین سید کا شمار بلاشبہ عالم اسلام کے ان گنے چنے سکالرز میں ہوتا ہے جو نام و نمود کی خواہش کے بغیر مشنری جذبے سے دن رات عالم اسلام کی خدمت کے لئے کوشاں ہیں۔ نیویارک کے ایک علاقے گریز کے ۲ کمروں کے اپارٹمنٹ میں رہنے والے پروفیسر سید کے کمرے میں جایئے تو آپ کو قدم رکھنے کی جگہ نہیں ملے گی یہاں ہر طرف کتابیں۔ اخبارات اور ٹائپ شدہ کاغذات بکھرے دکھائی دیں گے۔ پروفیسر سید کا خاص موضوع ''صیہونیت'' ہے اور بلاشبہ انہوں نے امریکہ جیسے ملک میں بیٹھ کر جہاں ایسے نازک موضعات پر تحقیق کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اپنے کام میں کمال حاصل کیا ہے۔

○

صیہونیت کے موضوع پر جتنا کام پروفیسر جعفر حسین سید نے کیا ہے اگر اسے جمع کیا جائے تو ایک الگ کتاب خانہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ شاید ہی عالم اسلام کی کوئی ایسی قابل ذکر یونیورسٹی رہی ہوگی جس نے پروفیسر سید کی خدمات س استفادہ نہ کیا ہو۔ ان کے ریسرچ پیپرز کی کاپیاں ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ اسلامی دنیا کے سفارت کاروں، سکالرز اور درسگاہوں کو بھیجی جاتی ہیں لیکن میرے خیال کے مطابق پاکستان کا کوئی ادارہ اپنے اس پاکستانی محقق کی اہمیت سے شاید ہی آگاہ رہا ہو۔ اس کی وجہ ایک تو گھر کی مچھلی دال برابر والی کہاوت ہو سکتی ہے اور دوسری اہم وجہ شاید یہ بھی ہے کہ علمی سطح پر ہماری درسگاہوں کا رابطہ ابھی بیرونی دنیا سے قائم نہیں ہوا یا اگر ہوا بھی ہے تو کچھ اتنا زیادہ نہیں۔

ایک دور تھا جب غیر مسلم دنیا تحقیق اور علم کے میدان میں مسلمانوں کی محتاج تھی اور اسلامی درسگاہوں پر غیر مسلم طلبا کا ہجوم جمع رہتا تھا۔ ایک یہ دور ہے کہ مسلمان اپنے جوہر قابل کو خود ہی نہیں پہچان پاتے۔ پروفیسر سید نے یہودیت او

صیہونیت پر مختلف موضوعات کے تحت تحقیق کی ہے اور ہر موضوع کا اپ ٹو ڈیٹ ریکارڈ اپنی ہمت سے فراہم کیا ہے ہمارے ہاں شاید بہت کم محققین کو اس بات کا علم ہوگا کہ مغربی دنیا میں جب آپ کسی خاص موضوع پر تحقیق کرتے ہیں خصوصاً ان موضوعات پر جو غیر مسلم دنیا کی دکھتی رگ بھی ہوں تو بسا اوقات صورت حال اتنی سنگین ہو جاتی ہے کہ آپ کو اپنی جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں۔

مغربی دنیا کتنی متعصب ہے اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے نیویارک کی پبلک لائبریری کے ''یہودی سیکشن'' کا ایک دورہ ہی کافی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ ولائبریری کے ''صیہونی'' حصے میں ''حضوض داخلہ محفوظ ہیں'' کی پابندی کے ساتھ بانا پڑتا ہے یہاں فوٹوگرافی کی اجازت نہیں۔

آپ کوئی بھی کتاب لائبریری سے نکلوانے سے پہلے ایک فارم پر کرتے ں جس میں اپنا نام مذہب قومیت موضوع تحقیق اور ایسے ہی بے شمار ذاتی نوعیت کے والات کے جوابات دینا ہوتے ہیں جس کے بعد ہی آپ کو مطلوبہ کتاب مل سکتی ہے۔ خیال رہے کہ یہاں آمد و رفت کا مکمل ریکارڈ۔ آنے والوں کی سرگرمیوں سمیت بیوٹر میں محفوظ ہوتا ہے اور اسی ریکارڈ کی بنیاد پر یہودی انٹیلی جنس ''موساد'' کے ئل ترتیب پاتے ہیں۔ جن میں یہودیت پر تحقیق کرنے والے تمام غیر یہودی ئالرز کا مکمل ریکارڈ رکھا جاتا ہے ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے اور اگر ساد کو یہ شک بھی ہو جائے کہ یہ شخص مستقبل میں صیہونیت کے لئے خطرات پیدا سکتا ہے تو اتنی صفائی سے اس کا صفایا کروایا جاتا ہے کہ کسی کو شک بھی نہیں گزرتا۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں رہتے ہوئے پروفیسر سید جعفر حسین نے صیہونیت پر یق میں کمال حاصل کیا ہے۔ اپنے کمترین وسائل کے ساتھ وہ دن رات اسی امر کے ے کوشاں ہیں کہ کسی بھی طرح اپنی معلومات کا یہ ذخیرہ کمپیوٹر کو منتقل کردیں تاکہ

مستقبل میں اگر کبھی عالمی سطح پر مسلمانوں نے صیہونیت کی ریشہ دوانیوں کا جواب دینا چاہا تو انہیں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

○

علی الصباح اپنے گھر سے نیویارک سب وے کی ٹرینوں پر سفر کرتے ہوئے مختلف لائبریریوں کی خاک چھاننے نکل جاتے ہیں اور رات گئے کتابوں اور فوٹو سٹیٹ کا بوجھ اٹھائے واپس لوٹ آتے ہیں۔ رات دیر گئے تک ان کتابوں میں سے نوٹس لیتے ہیں اور پھر مختلف آرٹیکل تیار کر کے ان کی فوٹو کاپیاں اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں اور سفارت خانوں کو ارسال کرتے ہیں۔ آج کل نیویارک کے اسلامی دانشورانہ حلقوں میں ان کی تازہ ترین تحقیقی مضمون ”مشرقی یورپ کی تبدیلیاں اور عالم اسلامی“ پر بحث عام سننے میں آتی ہے۔

ایک پاکستانی صحافی کی حیثیت سے میں نے پاکستان کے اس جوہر قابل کا مختصر تعارف کروا دیا ہے میں یہی کر سکتا تھا۔ یہ ارباب بست وکشاد خصوصاً ان تنظیموں اور درسگاہوں پر منحصر ہے کہ وہ پروفیسر سید کی خدمات سے کس حد تک استفادہ کرتے ہیں۔

پروفیسر جعفر سید صاحب کی ریسرچ کا خصوصی میدان فلسطین ہے اور کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے بعد سے جس طرح امریکہ اور اسرائیل نے ایک ”خود ساختہ امن“ کی طرف بے کس اور بے بس عربوں کا مارچ شروع کروا رکھا ہے اس صورت حال پر پروفیسر جعفر سید سے تفصیلی بات ہوئی۔ انہوں نے امریکہ کے اس نام نہاد امن منصوبے کے متعلق اظہار خیال اس طرح فرمایا۔

سرمایہ دارانہ، سامراجی، بے دین اور نام نہاد جمہوری مغرب میں اکثر الفاظ سے بھی ان کی معصومیت کا زیور سیاسی منفعت کے لئے چھین لیا جاتا ہے الفاظ کو سامراجی مفادات کا آلہ کار بنایا جاتا ہے نیز ان سے سامراجی ٹولہ کے ناپاک عزائم کی پردہ پوشی

بھی کی جاتی ہے لفظ ”امن Peace“ مغربی امریکی سامراج کی ترکش کا ایک تیر ہے۔

اس پس منظر میں، سامراج اور صیہونیت کے خلاف نبرد آزما طاقتوں و تحریکوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آگہی حاصل کریں کہ سامراجی و صیہونی کس طرح اس لفظ امن کو اپنے مفادات کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

قومی سطح پر استحصال کا ہدف طبقہ، مجبور و محکوم عوام، استحصالی معاشرہ کو جب اپنا مقدر تسلیم کر لے۔ ظلم و جبر کے خلاف اپنی مزاحمت ترک کر دے تو مقتدرہ طبقہ کے لئے معاشرہ پر امن ہو جاتا ہے آزاد دنیا کے سیاق و سباق میں (آزاد دنیا، دوسری سامراجی عالمی جنگ کی سامراجی تخلیق۔ یو ایس وہ برتر طاقت ہے جس کے ارد گرد دنیا گردش کرتی ہے) یہ آزاد دنیا ان ممالک پر مشتمل ہے جو حریف سوویت یونین کے نظام کا حصہ نہیں ہے۔ کے جوزف مہی ہرش، کرسچن سائنس مانیٹر مئی 28، 1987ء جب آزاد دنیا کے ناچار و بے کس عوام اپنے قومی مفادات، وامنگوں کو سامراجی مفادات اور لوٹ کھسوٹ کے لئے غیر مشروط طور پر قربان کر دیں تو اس وقت سامراجی اصطلاح میں آزاد دنیا میں امن قائم ہوتا ہے۔

یہ آزاد دنیا ہے کیونکہ یہاں دیو قامت تجارتی اکائیوں کو لوٹنے سے باز رکھنے کے لئے کوئی ہاتھ موجود نہیں ہے۔ آزاد دنیا کے عوام کے لئے یہ آزاد دنیا ایک غلام دنیا ہے جہاں ان سے قومی وسائل بزور شمشیر چھین لئے جاتے ہیں۔ اس عالمی ڈکیتی کو قائم رکھنے کے لئے امریکی حکومت ہر سال 80 بلین ڈالر خرچ کرتی ہے (کتاب 1972ء میں لکھی گئی) سی۔ آئی۔ اے اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اس عالمی ڈکیتی کے لئے معاون اداروں کے طور پر کام کرتے ہیں۔

اسی لئے سامراجیوں کے لئے ناصر، سوکارنو، بن باللہ، ہوچی من، لومبا ”آزاد دنیا“ کے امن کے لئے خطرہ تھے۔ ان محب الوطنوں کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے

مغربی امریکی سامراج اور ان کے علاقائی پٹھوؤں کو اپنے اپنے قومی وسائل کو لوٹنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے آزاد دنیا کے چند ممالک کو سامراجی پنجہ استحصال سے آزاد کرنا چاہا سامراج کے استبداد کو للکارا۔

سامراجی لغت میں ان محب الوطنوں کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ اس لئے یو این او کے چارٹر کی پرواہ کئے بغیر جو آج کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کا مدعی ہے نام نہاد مہذب مغرب اور امریکہ نے آزاد دنیا کی ان تنویروں کو ان محب الوطنوں کو سیاسی افق سے براہ راست اور بالواسطہ تخریبی کاروائیاں کر کے ہٹانے کی کوشش کی تاکہ آزاد دنیا میں دوبارہ سامراجی پٹھوؤں کو لاکر امن بحال کیا جائے۔

محب وطن سوئیکارنو کے ہٹائے جانے کے بعد ارض انڈونیشیا پر کیا گذری۔ امریکی تجارتی اکائیوں نے کس قیامت کی لوٹ مچائی اس کی نشاندہی 1970ء کا وال سٹریٹ میگزین کرتا ہے "مرکزی انڈونیشیا کا ہر انچ جہاں تیل موجود تھا۔ امریکی نے کھنگال ڈالا۔ ان کارپوریشنز میں اٹلانٹک رک فیلڈ (Atlantic Richfield) کال ٹیکس یونین آئل کو، گلف آئیل، کانٹی نینٹل آئل، کئی ایسی تیل کی کمپنیاں شامل تھیں ان کمپنیوں کی لوٹ کی گرفت میں مشرق بعید کا ۵۰ فی صد تیل تھا۔

آج مغرب اور امریکہ کے نزدیک وہ غیرت مند لیڈر ہے جو اپنی قوم کو "آزاد" دیکھنا چاہتا ہے وہ "آزاد دنیا" میں "سامراجی امن" کے لئے خطرہ کا باعث قرار پایا ہے۔

ان محب الوطنوں نے قومی بقاء کے لئے ایک ایسا راستہ اختیار کیا ہے جو سامراج کے حق میں نہیں ہے۔ انہوں نے قومی وسائل مغربی و امریکی سامراجیوں کو بطور نذرانہ پیش نہیں کئے اور نہ ہی اس نام نہاد جنگ میں شریک ہوئے ہیں جو امریکی سامراج اپنے تخیلاتی حریف کے خلاف جاری رکھے ہوئے ہے۔

جعفر صاحب کیا اسرائیل کا کردار بھی اسی ضمن میں امریکہ سے ملتا جلتا نہیں ہے؟

جواب۔ مشرق وسطیٰ میں "صیہونی امن" کی تشریح کا نمائندہ شارح سابقہ امریکی صدر کارٹر کو قرار دیا جاسکتا ہے اس کے نزدیک "پائیدار امن کی پہلی شرط، اس وقت پوری ہوتی ہے جس وقت صیہونی ریاست اسرائیل کے ہمسائے اس کو قبول کرلیں۔ امن کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ صیہونی ریاست حالت امن میں رہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مصر اور اردن اپنی اپنی سرحدیں صیہونی ریاست کے لئے کھول دیں۔ یہودیوں کو اپنے اپنے ممالک میں آمد و رفت پر پابندیاں کم کر دیں، تجارتی و ثقافتی سطح پر تعاون ہو۔ تاکہ صیہونیوں مصریوں اور اردنیوں کے درمیان ایک دوسرے کے لئے افہام و تفہیم بڑھے جس کے نتیجے میں جنگ کی فضا ختم کی جاسکے یہ ہے وہ نظریہ جو 16 مارچ 78ء کو اپنے خطاب میں صدر جمی کارٹر نے پیش کیا تھا۔ اس قبیل کا دھوکہ دینے والا صیہونی امن کا نام ہے اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں کے لئے بے عزتی، دست برداری اور محکومی 1880ء کی دہائی ہی سے جب صیہونیوں نے ارض فلسطین پر قبضہ جمانے کے لئے مختلف بہانوں سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے تو وہ ان ہی مقاصد کے تحت سرگرم عمل رہے ہیں۔ فلسطینیوں کی شدید مزاحمت کو کم کرنے کے لئے اپنے مکروہ و غاصبانہ عزائم کی پردہ پوشی کے لئے صیہونیوں نے ایسے ہی دلفریب نعرے وضع کرنے شروع کئے۔

امریکن اور یورپین صیہونیوں نے ارض فلسطین کی خرید و فروخت اس نعرہ کے ساتھ شروع کی کہ اس طرح فلسطینیوں کو ملازمت اور اعلیٰ معیار زندگی کی ضمانت ملے گی۔ نیز صیہونی خرید اراضی کسی خود غرضانہ خواہش کی محرک نہیں ہے۔ صیہونی جذبہ ہمدردی، اور انسانیت پروری کی خوب تشہیر کی گئی پہلی عالمی جنگ میں یہ صیہونیوں کی سازش تھی جس نے فلسطین پر برطانوی قبضہ کے لئے راہ ہموار کی۔ اور پھر یہی صیہونی کمال ڈھٹائی سے مقبوضہ فلسطین کے فلسطینیوں کو پیش کش کر رہے تھے اگر فلسطینی،

صیہونی ریاست کے حق کو تسلیم کرلیں تو وہ برطانوی قبضہ کے خاتمہ کے لئے کوشش کر سکتے ہیں۔ صیہونیت کے نو آبادیات کش کردار کو بہت زیادہ ابھارا گیا۔ اور اصل عزائم کو چھپایا گیا۔

1948ء کی پہلی جنگ بندی اس لئے عمل میں لائی گئی کہ مسلمانوں کی پیش قدمی کو معطل کیا جاسکے۔ اور اس اثنا میں ہارتے ہوئے صیہونیوں کی دوبارہ صف آرائی کی جاسکے۔ نیز امریکہ اور یورپ سے مزید فوجی اور افرادی امداد حاصل کی جاسکے۔ دوسری بار جنگ کا التوا اس لئے ہوا کہ صیہونی اپنی عددی کمزوری کی وجہ سے مزید پیش قدمی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

1956ء کی جنگ بندی اس لئے قابل قبول تھی کہ مصری فوجی طاقت کا شیرازہ فرانس اور برطانیہ (امریکی حلیف) کی مدد سے بکھیرا جاچکا تھا۔

1967ء کی جنگ بندی صیہونی توسیعی عزائم کی بار آوری کے بعد مسلط کی گئی۔ غزہ مغربی کنارا اور مشرقی یروشلم، صیہونی فوجی قبضہ میں تھے۔

1973ء کی جنگ بندی ایک طویل جنگ کے متحمل نہ ہونے کی وجہ سے قابل قبول قرار پائی۔ لیکن ان تمام جنگ بندیوں کو صیہونی امن پسندی کی دلیل کے طور پیش کیا گیا۔

اس تاریخی پس منظر میں، نام نہاد امن کی تشہیر امریکی فوجی پشت پناہی۔ آزادی پسند تحریکوں پر ضرب کاری کے بعد ان حرکی طاقتوں کو صیہونی امن پر مجبور کرنا صیہونیوں کی مشرق وسطی میں ایک حکمت عملی ہے اس چال سے صیہونیت مقصد قطعی واضح ہے۔ اس کا پیغام غیر مبہم امن مسلمانوں کے علم میں ہونا چاہئے تسلیم کرلینا چاہئے کہ مشرق وسطی میں صیہونی ایک غیر مبدل حقیقت ہیں۔ سادات اس صیہونی پیغام کے جال میں پھنسنے والا پہلا مصری راہنما تھا۔ صیہونی حکمت عملی

کامیابی کا طلوع اس وقت شروع ہوا جب سادات نے اعلان کیا "ماضی کے شعار کے برعکس اب ہمیں کسی بھی "امن فورم" کا مقاطعہ نہیں کرنا چاہئے امن سے ہماری پہلو تہی نے ہم سے آدھا فلسطین بعدازاں مکمل فلسطین پھر سنائی اور آخر میں گولان چھین لیا۔

سادات کی کوتاہ نظرا سے تاریخ کا یہ سبق باور نہ کرا سکی کہ جارح اور قابضین "استبداد" طاقتوں کے سامنے گھٹنوں کے بل گرنا اور عدم مزاحمت کی راہ اختیار کرنا ان جارح طاقتوں کے عہد کو طوالت اور بسا اوقات دائمیت بخشتا ہے۔

سادات نے صیہونی طاقتوں کے آگے سر جھکا اور کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں پر دستخط کر کے صیہونیت کو جن فوائد سے بہرہ ور کیا اس کا اندازہ گائڈیں رافیل کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

"پہلی بار ایسا ہوا کہ دریائے اردن کے منبع سے لے کر دریائے نیل کے منبع تک کا تمام علاقہ "خطہ امن" بن گیا یعنی کوئی للکار صیہونی غاصبانہ قبضہ کو للکارنے کے لئے موجود نہ تھی سنیائی، ایشیا اور افریقہ کے درمیان ایک واحد کڑی ہے جو پہلے ایک "راستے کی دیوار" تھی اب ایک پل کا کام دے رہی تھی۔

قاہرہ سب سے قریبی قابل رسائی دارالخلافہ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اسرائیل اس علیحدگی کی دیوار کو گرانے میں کامیاب ہوا اور عربوں سے اپنے جائز مقتدر ہونے کی سند حاصل کرسکا۔ پہلی بار جنگ کا نقارہ امن کے گیت الاپنے لگا۔ یروشلم میں مصر کے صدر نے اور اسرائیل کے وزیراعظم نے عرب اسرائیل دوستی کے ایوان کا سنگ بنیاد رکھا۔

سادات یہ بھی بھول گیا کہ اگر عالمی نقشہ سے صیہونی ریاست کو حرف غلط کی طرح نہیں مٹایا جاسکا تو اسکی واحد وجہ یہ ہے کہ مسلمانان عالم ایک مستقل مسلح مزاحمت نہیں کرسکے۔ صیہونی ریاست کا قیام ایک ننگی اور کھلی جارحیت کا نتیجہ تھا اور

آج بھی اس کے وجود کی ضمانت، امریکہ اور مغرب فوجی اور سیاسی پشت پناہی ہے اس کا
ایک فوجی برتر طاقت ہونا ہے۔ اس سامراجی تخلیق کی بقا چونکہ صرف طاقت پر ہے اس
لئے اس کے نیست و نابود بھی طاقت کے ذریعہ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ صیہونی ریاست کے پاس نہ ہی اتنے وسائل ہیں اور نہ ہی اتنی
افرادی قوت کہ وہ ایک مستقل مسلح مزاحمت کی کفیل ہو سکے۔ اسی مسلح مسلم مزاحمت
کا امکان صیہونیت کے لئے ایک بھیانک خواب ہے اس مسلح مزاحمت کے خطرہ کو
روکنے کے لئے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے دوسرے مرحلے کی تکمیل ضروری ہے تاکہ
دوسری مزاحمتی طاقتوں پی ایل او اور شام کو صیہونی امن کے کفن میں کفنایا جا سکے۔

جعفر صاحب بول رہے تھے اور میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا
کہ عالم اسلام کے ایسے دانشور کس طرح گوشہ گمنامی میں پڑے ہماری ملی بے حسی کا
مذاق اڑا رہے ہیں پروفیسر جعفر کہہ رہے تھے۔

صیہون سازشی ذہن بین الاقوامی اور مقامی سطح پر ناموافق عوامل کو ابھرتے دیکھ
رہا ہے۔ امریکہ صیہونی ریاست کا سب سے بڑا نگہبان آج ایک نیم جان دیو ہے اس کا
ایک ناقابل شکست عالمی طاقت کا طلسم پارہ پارہ ہو چکا ہے جاپان اور جرمنی کل کی ہاری
ہوئی اقوام آج امریکی اقتصادی جہانگیری پر ایک کاری ضرب لگا رہی ہیں ویت نام،
لبنان اور خلیج کی کھائیاں اس کے فوجی سر پھرے پن کو نکیل ڈال چکی ہیں۔ ویت نام
سے پسپائی کے بعد علاقائی سامراجی پٹھوؤں کی نگہبانی کا کام ناممکن ہو چکا ہے۔ فلپائن کا
مارکوس اور ایران کا شاہ ایک قصہ پارینہ ہیں۔ قوم پرست اٹھان ان سامراجی پٹھوؤں کو
ہڑپ کر چکی ہے امریکہ کا آزاد دنیا کا رکھوالا ہونے کا دعویٰ باطل ہو چکا ہے دنیا کی محکوم
قومیں اسے فرانس اور برطانیہ ایسی سامراجی طاقتوں کا رکھوالا خیال کرتی ہیں۔ جنہیں
امریکی سرپرستی نے پہلی اور دوسری عالمی سامراجی جنگ میں تباہ ہونے سے بچا لیا۔ اور

آج بھی آزاد دنیا کی مجبور محکوم اقوام کی نظر میں امریکہ کی پشت پناہی کے بغیر فرانس
اور برطانیہ ان اقوام کا اقتصادی و سیاسی استحصال نہیں کر سکتے۔ مشرق وسطیٰ میں
مسلمان مصر، شام، لیبیا، لبنان، عراق اور ایران میں فوجی و امریکی سامراج کی بالادستی کو
کامیابی سے للکار چکے ہیں۔ (اگرچہ مصر دوبارہ امریکی مہرہ بن چکا ہے اور عراق کو جنگ
کی دلدل میں پھنسایا جا چکا ہے) مقبوضہ فلسطین میں مسلمانوں کی نفرت امریکی اور
صیہونی سامراج کے لئے روزافزوں ہے۔

پروفیسر جعفر سید کہہ رہے تھے۔

ان ناموافق حالات کا احساس، صیہونیوں کو خبردار کر رہا ہے کہ وہ اس زیر زمین
ابلتے ہوئے لاوے کو جو مسلمانوں کی نفرت کی صورت میں ابل رہا ہے زیادہ دیر تک
نہیں روک سکتے۔ اگر صیہونی امن قائم ہو جائے تو وہ سکھ کا سانس لے سکتے ہیں۔ ایسا
نام نہاد امن صیہونیوں کے لئے مغرب نواز علاقائی طاقتوں کے لئے امریکہ اور مغرب
کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ یہ صیہونی امن، مسلمانوں میں نفاق کے بیج بوئے
گا۔ محبّ الوطن تحریکوں میں ابتری پھیلے گی علاقہ میں موجودہ سیاسی توازن کو قائم رکھا
جا سکے گا جو آج بھی امریکہ اور مغرب کے حق میں ہے۔

اس تجزیہ کی روشنی میں صیہونی امن کا تسلط مسلمانوں کی سیاسی موت ہے کیونکہ
مسلمان صرف مسلم مزاحمت کا راستہ اختیار کر کے ہی فلسطین کو آزاد کرا سکتے ہیں (اور
یہ روشن مثال کشمیری، فلپینی، اور ہندوستانی مسلمان بھی دہرا سکتے ہیں) لیکن اگر آج
فلسطینی مسلمان سامراجی اور صیہونی "امن" کا طوق اپنے گلے میں پہن لیتے ہیں تو
آنے والی نسلوں کے لئے صیہونی استبداد سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہو جائے گا لیکن میں
مایوس نہیں ہوں کیونکہ میرا ایمان ہے کہ جیالے مسلمان آزادی کی قیمت دینے کے
لئے تیار ہیں وہ صرف مغرب نواز مسلم حکومتوں کا منہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کب اپنا
مجاہدانہ کردار ادا کرتی ہیں جن کی بہترین مثال کشمیری مسلمان ہیں۔

○

امریکہ سے پہلے میں یورپی ممالک کی یاترا کر چکا تھا۔

مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ بد قسمتی سے جہاں کچھ پاکستانی اکٹھے ہو جائیں وہاں بڑا عجیب قسم کی قباحتیں جنم لیتی ہیں۔ لیکن میں یہ بات بھی جانتا تھا کہ یہاں زیادہ تعداد ان پاکستانیوں کی ہے جنہیں گردش حالات نے وطن سے دور ضرور کر دیا ہے لیکن جن کی سانس ابھی تک اپنے جنم بھومی ہی میں اٹکی ہوئی ہے۔

یہ وہ پاکستانی ہیں جو دراصل غیر ممالک میں پاکستان کے سفیر ہیں۔ جہاں تک ہمارے سفارتخانوں کا تعلق ہے ان سے متعلق کچھ بھی کہنا اس لئے موزوں نہیں کہ ان سے متعلق کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔

ہمارے بیشتر سفارتکار جب خصوصاً کسی مغربی ملک میں "زمام اقتدار" سنبھالتے ہیں تو انہیں ایک عجیب عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔

میں تو اسے نفسیاتی عارضہ ہی کہوں گا جبکہ مریض اسے اپنی کوئی خوبی گردانتا ہے۔

یہ لوگ فوراً خود کو فراعنہ مصر کے خاندان کا کوئی فرد جاننے لگتے ہیں ان کی گردن میں سریا فٹ ہو جاتا ہے۔

دماغ میں تکبر کا بھس بھر جاتا ہے۔

اور----

ان کی زبان سے وہ لفظ ادا ہونے لگتے ہیں جو عام حالات میں کوئی شریف آدمی نہیں کہتا۔

اگر پاکستان کا عام شہری کبھی یہ خواہش کرے کہ وہ اپنے ملک کے پرائم منسٹر یا صدر سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو عین ممکن ہے اس کی زندگی میں کبھی نہ کبھی یہ خواہش پوری ہو ہی جائے۔

لیکن----

یہاں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔

اگر کسی یورپی ملک کا کوئی ایسا پاکستانی نژاد شہری جس کے سر پر پاکستان کی خدمت کا بھوت سوار ہو جائے اپنے کسی منصوبے کے ساتھ اپنی کسی پلاننگ کے ساتھ جس میں وہ اپنی دانست میں پاکستان کی بھلائی کر رہا ہو اور اس پر اس کی تو ساری زندگی کی کرت کمائی اٹھ جائے اور سفیر صاحب یا ان کے اہل خاندان کی ایک پائی بھی خرچ نہ ہو۔ ایسے کسی بھی منصوبے یا ارادے کے ساتھ اگر وہ پاکستانی سفارتخانے کا رخ کرے تو محاورۂ اس پر کتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں عملاً اس کی ہر سطح پر حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اسے قدم قدم پر اتنا ذلیل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی اس ممکنہ گناہ کے ارتکاب سے روک دے۔

کسی پاکستانی شہری سے ملاقات کرنا کم از کم مغربی ملک کے پاکستانی سفارتخانے میں یہ لوگ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

انہیں ہر سطح پر ان کی بے بسی کا احساس دلایا جاتا ہے اور یہ باور کروایا جاتا ہے کہ وہ کوئی "کمی کمین" ہیں اور صاحب موصوف کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے ہے۔

گزشتہ کئی سال سے ہم اخبارات میں ایسی خبریں پڑھتے آرہے ہیں اور پاکستان میں ایسے تارکین وطن سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے سفارتخانوں کی مہربانی سے پاکستان کی کسی بھی خدمت سے توبہ کر چکے ہوتے ہیں ان کی کہانیاں ہمارے ہاں اخبارات میں شہ سرخیوں سے شائع ہوتی ہیں لیکن بیوروکریسی کی مہربانی سے ان کو پذیرائی پھر بھی نصیب نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب سوائے ہمارے کرپٹ سسٹم کے اور کچھ نہیں۔

عموماً ان لوگوں کو غیر ممالک میں سفارتی ذمہ داریوں پر تعینات کیا جاتا ہے جن سے حکمران خوش ہو جائیں یا پھر جن سے کوئی "تعلق خاطر" ہو اس حوالے سے وہ چونکہ حاکمان وقت کے اعزا میں شمار ہوتے ہیں اس لئے ان کے خلاف کسی کارروائی کا تصور بھی محال ہے۔

لیکن----

اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ ہماری دھرتی ایسی ہی بانجھ ہو گئی ہے کہ یہاں محبان پاکستان جنم ہی نہ لے رہے ہوں!

میں ایسے دوستوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے سفارتکاری کو اللہ کی طرف سے ملکی خدمت کا اعزاز جان کر پاکستان کو غیر ممالک میں عزت دلانے کے لئے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

جن کا جینا مرنا پاکستان کے لئے ہے اور جو دن رات اس دھن میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے ملک کا وقار بلند کرنے کے ہر ممکن سعی کریں۔

ان قابل عزت لوگوں کے دم قدم سے ہی آج ہمارا تھوڑا بہت بھرم قائم بھی ہے۔

○

امریکہ میں بسنے والے پاکستانی دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو آج سے بیس پچیس سال سے پہلے یہاں آئے حالانکہ ان میں بھی زیادہ تعداد وہ تھی جو کسی نہ کسی غیر قانونی طریقے سے ہی امریکہ میں داخل ہوئے اور یہاں کے قانونی شہری بننے کے بعد اب یہاں کے طبقہ اشرافیہ میں شمار ہونے لگے ہیں۔

یہ لوگ خود کو "پیشرو" کہلاتے ہیں اور ان میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو خود کو اب کوئی آسمانی قسم کی مخلوق سمجھنے لگے ہیں۔

ایسے بدقسمت بھی ان میں موجود ہیں جن کی بے راہرو اولادیں غیر مسلموں کے

بچوں کو جنم دے رہی ہیں لیکن وہ اسے "آزاد خیالی" تصور کرتے ہیں!

ایسے بدبخت بھی ان میں شامل ہیں جو خود کو کسی بھی حوالے سے پاکستانی کہلانا پسند نہیں کرتے۔

اور----

ایسے راہ گم کردہ بھی ان میں شامل ہیں جن کی ہر ممکن یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کے کسی عمل سے ان کی اصلیت آشکار نہ ہو جائے۔

یہ لوگ عموماً الگ تھلگ رہتے ہیں۔

ان کا قیام ان علاقوں میں عموماً نہیں ہوتا جہاں پاکستانی زیادہ تعداد میں آباد ہوں اگر ان کے گھر کے نزدیک تین چار پاکستانی گھرانے آباد ہو جائیں تو انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے اور وہ کوشش کر کے اس علاقے سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ کسی ایسے علاقے میں جا کر آباد ہوتے ہیں جہاں انہیں کوئی پاکستانی کے حوالے سے جاننے والا نہ ہو---

لیکن----

ان لوگوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ایک ایسے ملک میں جا بسے ہیں جہاں کے "اشراف" ان کو رنگدار نسل ہونے کے سبب کبھی دوسرے درجے سے زیادہ کا شہری تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے----

گو کہ ان لوگوں کی خواہش ہی رہتی ہے کہ اپنی شناخت بھول کر خود کو امریکن ہی نالیں اور وہ ایسی ہر غیر مہذب غیر مذہبی حرکت کرتے ہیں جن سے ان کے ہمسائے نہیں اپنے جیسا ہی سمجھیں۔

لیکن----یہ احساس کمتری انہیں ہمیشہ ستائے رکھتا ہے کہ پاکستان کا حوالہ ہی ان اصلی حوالہ ہے جس سے کٹ کر وہ ٹوٹی پتنگ کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے بالآخر ی لٹیرے کے ہاتھ لگ جائیں گے----

یہ لوگ کبھی کبھی پاکستانیوں کے حوالے سے ہونے والی تقاریب میں شرکت کرتے ہیں یا پھر بادل نخواستہ انہیں کم از کم عید کی نماز کے لئے مسجد میں آنا پڑتا ہے۔ سفارتخانوں کی تقاریب البتہ یہ مس نہیں کرتے۔ کیونکہ یہاں خود نمائی کے مواقع انہیں خوب میسر ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کو اسی اور نوے کی دہائی میں امریکہ آنے والے ان پاکستانیوں سے بڑی نفرت ہے جو ان کے ماضی کی طرح یہاں محنت مزدوری کر رہے ہیں حالانکہ یہ لوگ پہلے خود بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔

طبقہ اشرافیہ کے ان امریکن پاکستانیوں کا کہنا ہے کہ ان لوگوں کی آمد سے پاکستان کا امیج بری طرح بگڑا ہے جبکہ اس بات کو امریکہ کی مختلف ریاستوں کی پولیس تسلیم کر چکی ہے کہ امریکہ میں غیر قانونی طور پر پناہ حاصل کرنے کے بعد یہاں رہ جانے والے پاکستانی امریکن قانون کا سب سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔

پیشہ ور امریکن پاکستانی بھی یہ بات جانتے ہیں کہ امریکہ میں آنے والا ہر پاکستانی بہت پرامن اور قانون کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اس بے چارے کی ساری توانائیاں پہلے خود کو ''لیگل'' کرنے پر صرف ہوتی ہیں جب چار پانچ سال بے پناہ ذلت مشقت اٹھانے کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح گرین کارڈ حاصل کر لے تو اس کے باقی کی ساری زندگی اپنے بیوی بچوں، والدین اور عزیز رشتہ داروں کو یہاں لانے اور بسانے پر ہی خرچ ہو جاتی ہے۔

ان حالات میں اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ کوئی اور ''ایڈونچر'' کرے --- لیکن --- اس کے باوجود ''پیشہ ور امریکن پاکستانی''، ''نئے امریکن پاکستانیوں'' کو معاف کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

انسان اپنی فطرت میں کبھی برا نہیں ہوتا۔

ہمارا بطور مسلمان یہ ایمان ہے کہ انسان فطرتاً نیک ہوتا ہے حالات اسے اچھا برا بنا دیتے ہیں۔ اس معاشرے میں ایسی مثالیں بھی انہی اشرافیہ طبقے میں پائی جاتی ہیں کہ جو لوگ آج سے تیس سال پہلے امریکہ آئے اور تیس پینتیس سال سے ان کا ایک ایک سانس اپنے ملک اور پاکستانیوں کی خدمت کے لئے وقف ہے۔

یہ لوگ اپنی تمام تر توانائیوں سے پاکستان کا بھرم قائم رکھنے کے لئے کوشاں ہیں خصوصاً بھارت کی طرف سے امریکہ میں پاکستان کے خلاف چلائی جانے والی زہریلی مہم کا مقابلہ اپنی سطح پر کرتے ہیں اور وہ کام کر جاتے ہیں جو در اصل ہمارے سفارتخانوں کے کرنے کا ہے جبکہ ہمارے سفارتکاروں کو اس کی مہلت نہیں ہوتی۔

○

دوسرا طبقہ ان پاکستانیوں کا ہے جو اپنی متاع حیات لٹا کر امریکہ آئے تھے اور اب ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی لگن ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی ''لیٹ نکالیں'' یہ لوگ عموماً غیر قانونی طور پر نوکریاں حاصل کرتے ہیں۔ اور معمول سے آدھے معاوضے پر انتہائی گھٹیا قسم کے کام کرنے ہوتے ہیں۔

کام کوئی گھٹیا نہیں ہوتا لیکن میں نے ''گھٹیا'' کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ وہ کم از کم اپنے ملک میں ایسا ہرگز نہیں کرتے۔ مثلاً کوئی ایم۔ اے یا ایل ایل بی نوجوان کستان کے کسی پٹرول پمپ پر گاڑیوں میں پٹرول بھرنے کو ''قابل عزت پیشہ'' نہیں بھتے چوکیداری پسند نہیں کرتا، جھاڑو پوچا لگانا معیوب جانتا ہے۔ ٹائلٹ اور باتھ روم اف کرنا اپنے منصب کے شایان شان نہیں جانتا جبکہ وہاں امریکہ میں اگر ایسا کوئی ی کام کسی بھی غیر قانونی پاکستانی کو مل جائے جہاں اسے اس کام کا معاوضہ بھی مروجہ عاوضے سے نصف ملے اور کام بھی معمول سے دگنا کرنا پڑے۔ لیکن وہ اسے اپنی خوش نتی جان کر بڑے جی جان سے یہ کام کرتا ہے۔ ان لوگوں کو صحیح معنوں میں اپنے وطن

کی قدر یہاں آکر ہوئی ہے لیکن بد قسمتی سے وہ اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں آنے کے بعد اپنے ضمیر اور غیرت کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو جاتے ہیں کہ پھر کئی کئی سال وسائل میسر نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

میری ملاقات ایسے درجنوں نوجوانوں سے ہوئی جو دھوبی کے کتے کی طرح اب گھر اور گھاٹ دونوں سے محروم ہو کر شدید اضطراب کا شکار ہیں۔

پاکستان میں اپنا سب کچھ بیچ کر وہ یہاں آئے تھے امریکہ میں ان کے سارے خواب بکھر گئے ہیں اور وہ بے چارے بمشکل اتنا ہی کما پاتے ہیں جس سے پیٹ کی آگ بجھا سکیں یا پھر اپنے اپارٹمنٹ کا کرایہ ادا کر سکیں۔

نیویارک کے گنجان آباد علاقوں میں دو دو کمروں اور ایک ایک باتھ روم کے اپارٹمنٹس میں ایک ہی وقت میں بیس بیس ایسے پاکستانی زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے ہیں۔

شاید آپ کو یہ بات عجیب لگے لیکن اس تلخ حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ایک چارپائی پر اگر دن کے اوقات میں ایک پاکستانی سوتا ہے تو رات کو دوسرے کی بار ہوتی ہے۔

دن کی ڈیوٹی والا جس چارپائی پر رات کو سوتا ہے وہاں رات کی ڈیوٹی والا د گزارتا ہے۔

یہ لوگ پاکستان میں بھوکے نہیں مر رہے تھے!

بے گھر نہیں تھے-----

اور---ان میں سے بیشتر بے روزگار بھی نہیں تھے۔

اس کے باوجود وہ یہاں کیوں چلے آئے؟ اور اب یہاں چوپائیوں جیسی زن کیوں جی رہے ہیں؟

ان سوالات کے جوابات بہت تلخ اور شاید ناقابل ہضم ہیں۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا قاتل ہو جس نے کسی بے گناہ کے قتل کا کوئی نہ کوئی جواز نہ بنایا ہو----

یہ تو پھر بھی نارمل انسان ہیں؟ پڑھے لکھے ہیں۔ اچھے گھرانوں سے ان کا تعلق ہے اور وہ اپنی امریکہ آمد کے ایسے ایسے جواز بتاتے ہیں جنہیں سننے والے کو خواہ مخواہ ان سے ہمدردی ہونے لگتی ہے----

دکھ کی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ جو عزائم یہاں لے کر آئے تھے ان میں بھی انہیں امیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

میں جب کبھی ایسے کسی نوجوان سے ملتا میرے دل سے یہ دعا ضرور نکلتی کہ خدا رے اس کو بے پناہ ڈالر مل جائیں کم از کم اس لحاظ سے تو اس کا ضمیر مطمئن ہو کر اس نے پیسوں کے لئے اپنا وطن چھوڑا اور وہی نہ مل سکے----

حصول رزق کے لئے اللہ کی زمین پر سفر کرنا ممکن ہے عین ثواب رہا ہو لیکن اس ات میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ میں داخل ہونے کے لئے ہمارے نوجوان جو ریقے اپناتے ہیں ان سے اب امریکی چڑنے لگے ہیں اور صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ ب انہیں جینوئن پاکستانی بھی فراڈ لگتے ہیں۔

پاکستان میں موجود امریکی قونصل خانوں میں ویزے کے جائز حقداروں کے اتھ امریکیوں کے ناجائز سلوک کا پس منظر یہی ہے----

اور یہی وجہ ہے کہ اب وہ ہر پاکستانی کو پاکستانی دستاویزات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ں۔اس صورتحال تک ہمیں پہنچانے اور کئی نوجوانوں کا بیڑہ غرق کرنے میں اہم کردار مفلٹ نما کتابیں ادا کر رہی ہیں جنہیں فریسٹریشن کے شکار نوجوانوں کی جذباتی بلیک یلنگ کے لئے "ویزہ حاصل کرنے کے طریقے"---"امریکہ جانے کے طریقے" غیرہ وغیرہ جیسے بازاری عنوانات کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ ایسی کتابیں لکھنے والے

جانتے ہیں کہ ان کی کتابیں پڑھ کر کسی کو امریکہ میں جائز داخلہ، نوکری یا گرین کارڈ نہیں مل سکتا لیکن وہ کتابیں چھاپ رہے ہیں اور نوجوان گمراہ ہو رہے ہیں۔

اس طرح ہمارے وہ امیگریشن کے ذمہ داران بھی قابل گردن زدنی ہیں جو لاکھوں روپے سے اپنے پیٹ کا جہنم بھر کر غیر قانونی اور جعلی دستاویزات پر سفر کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

اس طرح ان کا جہنم بھرتا رہتا ہے۔

لیکن--- قومی ایئرلائن کا بیڑہ غرق ہو رہا ہے۔ کیونکہ کسی بھی ایئرلائن سے کسی غیر قانونی مسافر کی آمد کی سزا امریکی قوانین کے مطابق متعلقہ ائیرلائن کو بھگتنی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جس بری طرح پاکستان کا امیج تباہ ہو رہا ہے وہ ایک الگ اور انتہائی تکلیف دہ بات ہے۔

حیرت ہے کہ حکومت ان واقعات کا نوٹس نہیں لیتی۔ ایسا ممکن ہی نہیں کہ ہماری امیگریشن حکام اگر نہ چاہیں تو کوئی جعلی دستاویزات پر سفر کر سکے۔

آج ہمیں نیوجرسی جانا تھا--- جہاں سے پھر اٹلانٹک سٹی---!

نیوجرسی کو دیکھنے کی ایک بڑی وجہ تو یہاں حضرت سلامت شاہ کی زیارت تھی اور دوسری یہاں کے عرب مسلمانوں کی وہ شہرت جس نے مجھے اس طرف راغب کیا تھا۔ مصری عالم دین کی امریکہ میں ہونے والے بم دھماکوں میں گرفتاری کے بعد سے امریکیوں نے نیوجرسی پر سرخ نشان لگا دیا ہے اور جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں تب وہاں صورتحال ایسی ہو گئی تھی کہ اکثر عرب مسلمانوں کے گھروں پر دستک دے کر امریکن ایف۔ بی۔ آئی والے صرف خانہ تلاشی کا شوق پورا کرنے کے لئے گھس جایا کرتے تھے۔

نیوجرسی کا رستہ تو شاید بہت زیادہ نہیں لیکن اسے انڈسٹریل سٹیٹ کہنا بھی غلط نہ ہوگا---ٹرینٹن سے نیویارک تک دو دور دھواں اگلتی فیکٹریاں قطار کی صورت دکھائی پڑتی ہیں اور امریکی موجد ایڈیلین کا بسایا صنعتی شہر "ایڈلین سٹی" بھی یہاں موجود ہے۔

امریکنوں نے اپنی تمام ریاستوں کو کچھ محبتوں کے نام دے رکھے ہیں جیسے کیلیفورنیا کو امریکہ کی گولڈن سٹیٹ کہا جاتا ہے اسی طرح نیوجرسی کو امریکن گارڈن سٹیٹ کہتے ہیں۔

یہاں کے تعارفی کتابچے کے مطابق نیوجرسی میں پھلوں، پھولوں، سبزیوں کی بے پناہ بہتات سے متاثر ہو کر سکاٹ لینڈ کے ایک سیاح نے 1684ء میں اسے اس خطاب

سے نوازا تھا----

نیو جرسی میں جن صاحب نے سب سے پہلے قدم رنجہ فرمایا ان کے نام پر نیویارک کا دنیا کا سب سے بڑا لٹکتا ہوا پل سسپنشن برج Suspension Bridge بنایا گیا ہے----

ایک محتاط اندازے کے مطابق نیو جرسی میں دو ہزار سے زائد فیکٹریاں اور کارخانے قائم ہیں لیکن میں نے زیادہ تر وہی گھرانے دیکھے جن کا رزق نزدیکی علاقوں نیویارک اور فلاڈلفیا سے جڑا تھا اور وہ یہاں رہائش کے باوجود وہیں کام کاج پر جایا کرتے تھے۔

نیو جرسی کی تاریخی حیثیت کو البتہ چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے امریکن صدر جناب جنرل واشنگٹن کی مشہور زمانہ کراسنگ دریائے ڈیلاویئر عبور کر کے ٹریٹن کے نزدیک ہوئی تھی اور امریکن تاریخ کے مطابق قریباً سو انقلابی جنگیں اس علاقے میں لڑی جا چکی ہیں۔ نیو جرسی میں کالے مسلمانوں نے اپنی تعداد خاصی بڑھالی ہے اس کا سارا کریڈٹ ان مسلمان مبلغین اور علماء کو جاتا ہے جنہوں نے ان راہ گم کردہ انسانوں کو راہ راست پر لگایا امریکہ میں کالوں سے زیادہ ظالم اور مظلوم کوئی قوم نہیں ظالم اس لئے کہ آپ ان سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ جرائم میں یہ لوگ سب سے آگے ہیں امریکہ کے ہر قابل ذکر شہر کے ''سنٹر سٹی'' پر قابض ہیں خصوصاً ٹرائی سٹیٹس یعنی نیویارک، واشنگٹن اور پنسلوینیا میں تو انہوں نے بدمعاشی کے جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں۔

چند ڈالروں کے لئے کسی کو قتل کر دینا ان کے لئے قطعاً معیوب نہیں۔ ڈرگ کے کاروبار میں ابھی تک ان کی برتری قائم ہے گو کہ اب اس میں یہ کالے پیچھے ہٹ رہے ہیں اور دوسرے تارکین وطن خصوصاً ہسپینی، چائنیز، اٹلی وغیرہ کے گینگ بھی قائم ہو رہے ہیں لیکن ان کے اپنے اپنے علاقے مخصوص ہوتے ہیں مثلاً چائنا ٹاؤن امریکہ کے جس شہر میں بھی موجود ہے اس کے اندر چینیوں کی بادشاہت ہوگی اس طرح

نیویارک کے کچھ علاقوں میں ہسپینی، اٹالین، آئرلینڈ وغیرہ کے مافیا قائم ہیں اور لاس اینجلس یا لاس ویگاس میں برازیل کے مافیا موجود ہیں لیکن ان کی تعداد کالوں سے زیادہ بھی نہیں ہو سکتی۔

امریکن نیگرو کے جرائم کے پس پردہ دراصل وہ صدی کا استحصال ہے جو نسل در نسل گورے امریکنوں نے ان کے ساتھ کیا۔ غلام بنا کر انہیں جانوروں کی طرح اپنے ملک میں لانے والے امریکنوں نے قریباً سو سال تک انہیں جانوروں کی زندگی جینے پر مجبور کیا اور جب کالوں نے امریکہ میں برابر کے شہریوں کے حقوق بھی بے پناہ قربانیاں دینے کے بعد حاصل کر لئے تب بھی امریکن گوروں نے انہیں مکمل امریکن تسلیم نہیں کیا۔

گو کہ امریکی قوانین میں سختی سے مساوات کا اصول قائم کیا گیا ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کے عام شہری کو بھی امریکی صدر کے برابر حقوق حاصل ہیں لیکن یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ امریکن خصوصاً کالوں کے سلسلے میں بہت متعصب واقع ہوئے ہیں۔

اگر امریکہ میں کوئی کالا کسی اہم فیڈرل عہدے پر موجود ہو تو یہ امریکن عوام کے لئے ''خبر'' ہوتی ہے۔

امریکنوں کی آزاد خیالی اور مہذب ہونے کے دعوے اپنی جگہ لیکن بظاہر ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ اگلے پچاس سال میں بھی کوئی کالا امریکہ کا صدر بن سکتا ہے۔

آج ان کالوں کے لئے امریکہ میں صرف تین کام رہ گئے ہیں سب سے پہلا کہ وہ منشیات کے عادی ہو کر اپنی نسل کو برباد کرتے رہیں۔

دوسرا کہ وہ اتھلیٹ بن جائیں اور تیسرا یہ کہ وہ ''گویئے'' بن جائیں----!

اور---- آپ دیکھ لیجئے کالے ان تینوں میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے

رہے ہیں۔

ان تینوں ذرائع سے دراصل وہ اپنی فریسٹریشن کو منفی اور مثبت دونوں طرح ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

○

محرومیوں کا شکار اور حالات سے نالاں اور شاکی رہنے والے یہی کالے امریکن جب دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو دنیا کے بہترین انسان بن جاتے ہیں---

سلامت علی بھی ایک ایسے ہی کالے امریکن ہیں جنہوں نے چند سال پہلے جب وہ ایک جیل میں منشیات فروشی کے جرم میں سزا کاٹ رہے تھے ایک مسلمان مبلغ کے ہاتھوں پر بیعت کی اور اسلام کی حقانیت کو دل و جان سے قبول کر لیا آج نیو جرسی میں وہ ایک پیر کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں دینی اور دنیاوی دونوں نعمتوں سے خوب نوازا ہے۔ ان کے محبت کرنے والے انہیں "سیدی" کہتے ہیں لیکن وہ اسے پسند نہیں فرماتے۔

ان کی علم دوستی اور خصوصاً پاکستان سے محبت مجھے کشاں کشاں ان تک لے گئی زندگی کے وہ چالیس گھنٹے جو میں نے ان کی معیت میں گذارے میری زندگی کے انتہائی عزیز لمحات بن گئے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام کی عظمت و حقانیت کے جو چراغ سلامت علی اور ان جیسے سینکڑوں کالے مسلمانوں کی صورت میں پیر سید مبارک شاہ گیلانی نے جلائے ہیں ان سے آگے چراغاں کا سلسلہ جاری رہے گا اور کچھ عجیب نہیں کہ اس کفر کدے میں پھر ایمان کی ایسی بہار آئے کہ جس سے ہر کوئی فیض یاب ہو---

○

امریکنوں نے دنیا پر حکومت کے لئے انسانوں کے دلوں تک پیٹ کے ذریعے رسائی حاصل کی ہے۔ کوکا کولا سے میکڈونلڈ، کے ایف سی (کنٹکی چکن) اور پیزا ہٹ

ی امریکنوں نے بہت تیزی سے ساری دنیا خصوصاً تیسری دنیا کے ترقی یافتہ ممالک پر رفت کی ہے۔

کے ایف سی کی کہانی بڑی عجیب ہے۔

کرنل سینڈرز نامی ایک ویٹر کس "ڈائنز" میں نوکری کرتے تھے ان کے مالک نے یک روز کرنل صاحب کو کسی بات پر سرزنش کی اور اچھی خاصی ڈانٹ بھی پلا دی، رنل سینڈرز نے اسے اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیا۔

حضرت وہاں سے رخصت ہوئے اور اپنی سائیکل کو اپنا سفری ہوٹل بنا لیا سائیکل کے پیچھے ایک لکڑی کا بکس باندھ کر کرنل صاحب نے اس میں سینڈوچ رکھ کر بیچنے روع کر دیئے۔

موصوف کا یہ دھندہ ایسا چلا کہ وہ "چکن سینڈوچ"--- باقاعدہ چکن پر آ گئے اور نا ریسٹورنٹ کھول لیا۔

اس ریسٹورنٹ کا نام انہوں نے "کے ایف سی" رکھا یعنی "کنٹکی فرائڈ چکن"۔ رنل صاحب کا تعلق چونکہ کنٹکی شہر سے تھا اسی مناسبت سے نام رکھا اور دیکھتے ہی یکھتے وہ سارے امریکہ پر چھا گئے پھر یہ سلسلہ امریکہ سے چلا اور آج ساری دنیا میں ان کے ڈنکے بج رہے ہیں۔

○

امریکہ جائیں اور "نیاگرا فال" نہ دیکھیں یہ کہاں ممکن ہے---

ایک روز ہم بھی اس کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے--- یوں تو امریکہ کی ہر یاست کے اپنے ہی محاسن ہیں لیکن پنسلوینیا سٹیٹ کا دامن اس ضمن میں خاصا بھرا ہوا کھائی دیتا ہے۔

ہم اس وقت بشکل فالز Bushkill Falls کے علاقے سے گذر رہے تھے گو کہ

یہ سفر ہائی وے پر ہوتا ہے لیکن اس علاقے کی خوبصورتی دل موہ لینے والی تھی۔ رز
کار ڈرائیو کر رہا تھا اور میں آبشاروں سے مزین اس علاقے کی خوبصورتی میں کھویا
تھا----

شام ڈھل رہی تھی جب ہم "بلیو مونٹین" Blue Mountains کے علا
میں داخل ہوئے نیلے رنگ کے ان پہاڑوں کا اپنا ایک حسن ہے اس علاقے سے گ
کے لئے آپ کو قریباً دو میل لمبی ایک سرنگ سے گزرنا پڑتا ہے اور اس سفر کا یہ ش
سب سے خوبصورت مرحلہ ہوتا ہے----

اس کے بعد کا سارا سفر قریباً پہاڑی علاقے پر مشتمل تھا۔ اس سلسلہ ہائے کوہ
اپیلا چین Appalachain کا پہاڑی سلسلہ کہا جاتا ہے اور ہر علاقے کے نسبت
پہاڑوں کے نام بدلتے جاتے ہیں۔

پہاڑی سلسلے کی بل کھاتی خوبصورت سڑکوں پر رزاق کسی ماہر پائلٹ کی طر
گاڑی کو چلا نہیں بلکہ اڑا رہا تھا۔ میں اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ موجود اور میرے پیچ
"مانا" بیٹھا تھا۔

مان سنگھ عرف "مانا" میرے بزرگ دوست سردار آتما سنگھ کا کوئی نزدیکی رش
دار تھا جو کسی طرح مشرقی پنجاب سے اپنی جان بچا کر نکلا اور اب آتما سنگھ کے ساتھ
رہ رہا تھا----

بلا کا ذہین یہ سکھ نوجوان بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔

اس نے اپنا ٹرک رکھا ہوا تھا اور آج بطور خاص ہمارا ہم سفر تھا۔ آتما سنگھ خ
میرے ساتھ جانے کی خواہش کر رہے تھے لیکن ان کی بیماری کی وجہ سے میں
معذرت کر لی حالانکہ اس بات پر وہ تین دن مجھ سے ناراض اور ان کی سنگھنی بہ
خوش رہے رات اپیالاچین کی پہاڑیوں پر اتر رہی تھی---

لیکن---اس علاقے کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اسے امریکنوں نے رات
میں بھی دن بنا رکھا تھا۔ ہمارے سامنے ایک چمکدار اور سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک
تھی---جس پر رزاق گاڑی چلاتے ہوئے کچھ گنگنا رہا تھا جبکہ "مانا" مجھے امرتسر میں
سکھوں پر ٹوٹنے والی قیامت کے احوال سنا رہا تھا---

اب ہم پنسلوینیا سے نیویارک سٹیٹ میں داخل ہو رہے تھے---

مجھے اب باقاعدہ اونگھ آنے لگی تھی جبکہ میرے دونوں ساتھی تازہ دم تھے۔ ایک
جگہ "کارننگ" کے قریب رک کر ہم نے "سروس ایریا" سے خود کو تازہ دم کیا اور اب
مشرقی سمت میں "مانا" کے پاس لکھے ایک ایڈریس کی تلاش میں نکل پڑے قریباً پندرہ
منٹ بعد ہم "ہوٹل ماؤنٹ" کے سامنے موجود تھے۔

پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کر کے نیچے اترے تو دروازے پر ایک اور سردار
صاحب کو اپنا منتظر پایا وہ "مانا" کی شکل دیکھ کر قریباً بھاگتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور
"ویرجی" کہہ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

یہ سردار ناظر سنگھ تھا جو اپنی ڈاکٹر بیوی کے ساتھ یہاں ایک موٹل چلا رہا ہے--
ڈاکٹر امرت کور کاؤنٹر پر موجود تھی لیکن شیشے سے ہمیں دیکھ کر وہ بھی باہر آ کر
"مانے" سے لپٹ گئی ڈاکٹر امرت کور "مانے" کی بہن اور ناظر سنگھ بہنوئی تھے۔ دونوں
بہن بھائی آنکھوں میں آنسو لئے ایک دوسرے سے سات سال بعد مل رہے تھے۔

مشرقی پنجاب میں سکھوں پر ٹوٹنے والی قیامت کے بعد مانے کے دونوں بڑے
بھائی بھارتی فوج کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ ان کا ٹرانسپورٹ کا بزنس تباہ ہو گیا تھا
اور وہ خود چھ ماہ پہلے بمشکل جان بچا کر امریکہ پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ امرت کور ان
دنوں کینیڈا کسی کورس پر گئی ہوئی تھی اور چند روز پہلے ہی اس کی واپسی ہوئی تھی آج
دونوں بہن بھائی آپس میں ملے تو بچوں کی طرح رونے لگے--- پھر جلد ہی نارمل

ہو گئے----

آتما سنگھ نے انہیں فون کر کے ہماری آمد سے آگاہ کیا ہوا تھا اور راستے میں دو مرتبہ مانے نے بھی انہیں فون کر کے بتادیا تھا کہ ہم کتنے بجے تک پہنچ رہے ہیں---

"کارننگ" کے خوبصورت پہاڑی سلسلے کی ایک بلندی پر واقع سردار ناظر سنگھ کا بنگلہ اگر بھارت میں ہوتا تو بھوت بنگلہ دکھائی دیتا لیکن یہاں ایسا نہیں تھا---

ایک دوسرے سے قریباً آدھے فرلانگ کی دوری پر یہاں کی پہاڑیوں پر بڑے خوبصورت بنگلے بنے ہوئے تھے جہاں متمول لوگ ہی قیام کر سکتے تھے۔

ناظر سنگھ کی دونوں بیٹیوں نے ہمارے لئے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ دونوں اپنے ماموں کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں۔

رات ہم نے ان کے ہاں گذاری اور اگلے روز صبح کے ناشتے کے بعد اپنی گاڑی یہاں چھوڑ کر ان کی ویگن میں عازم سفر ہوئے۔

ویگن ناظر سنگھ چلا رہا تھا اور ڈاکٹر امرت کور اور ان کی دو بیٹیاں جنہوں نے دو بیگ اشیائے خورد ونوش کے بھر کر رکھے ہوئے تھے ہم تینوں کو بضد ہو کر کبھی سوڈا، کبھی کافی، کبھی چائے اور دوسرا الم غلم پلا اور کھلا رہی تھیں۔

امریکہ میں آکر اگر آپ کھانے پینے کی اشیاء کا جائزہ لیں تو یوں دکھائی دے گا جیسے امریکنوں کو کھانے کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں اور یہ بات ہے بھی صحیح----

کسی آفس میں جائیے----

کسی سٹور پر جائیے----

کسی سرکاری، غیر سرکاری جگہ جائیے آپ کو بڑے سنجیدہ امریکی ایک ہاتھ سے لکھتے اور دوسرے ہاتھ سے برگر کھاتے یا کافی پیتے دکھائی دیں گے----

یہ لوگ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے غرض ہر وقت کھاتے رہتے ہیں۔ ایک محتاط

اندازے کے مطابق امریکہ کے "میکڈونلڈ" میں "ٹریش" یعنی وہ کھانا جو بچ جاتا ہے جمع کیا جائے تو براعظم افریقہ کا ہر بھوکا شہری پیٹ بھر کے چین کی نیند سو سکتا ہے۔

لیکن ایسا ممکن نہیں کہ اس کے پس پردہ بھی امریکن سیاست دکھائی دیتی ہے----

کارننگ جہاں ناظر سنگھ کا گھر تھا امریکن کراکری کے لئے مشہور ہے۔ یہاں کے برتن خصوصاً یہاں کی "چینکیں" امریکن بہت پسند کرتے ہیں واپسی پر ایسی ایک چینک اور دو کپ ناظر سنگھ نے دیگر تحائف کے ساتھ میرے پلے سے بھی باندھ دیئے تھے۔ جن میں سے میں دو کپ بمشکل لاہور تک پہنچا سکا۔ شام اور رات کا وقت ہم نے یہاں گزارا----

○

نیاگرا فال کا سفر شروع ہو گیا---!

کانوں میں ایک مانوس سی آواز سنائی دی یہ نیاگرا کے جوشیلے پانیوں کا شور تھا۔

اچانک ہی آسمان نے کروٹ بدلی اور بمشکل دو تین منٹ کے نوٹس پر اپنی گڑگڑاہٹ سے دل ہلا دینے والے بادلوں نے ساون کی بارش کی سی صورت اختیار کر لی----

دن میں نیاگرا پر شام اترنے لگی----

بادلوں کی گڑگڑاہٹ، آسمانی بجلیاں اور تیز بارش کے ساتھ ساتھ نیاگرا کے پانی کا شور اس منظر کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا----

نیاگرا سٹی سے گزر کر ہم اب "چین بو برج" پر آگئے تھے----

دن میں رات کی بتیاں روشن تھیں۔ ناظر سنگھ ماحول سے لاتعلق بالکل نارمل ہو کر ویگن چلا رہا تھا جبکہ اس کی بیٹیاں ہمیں تفصیلات بتاتی جا رہی تھیں اور ڈاکٹر امرت کور اپنے مووی کیمرے سے فلم بنا رہی تھی۔

اب ہم آبشار کے بالکل سامنے آگئے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے قدرت کا عظیم نظارہ موجود تھا۔ آبشار کا دودھیلا پانی دور دور تک مار کر رہا تھا۔

بارش تھم گئی تھی----

میں باقی مسافروں کی طرح مبہوت سا باہر آ گیا---

رزاق کا کیمرہ کٹا کٹ میری اور باقیوں کی تصاویر بنا رہا تھا اور میں گم سم اللہ کی قدرت کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔

پانی کسی پنجرے میں بند بھوکے شیر کی طرح دھاڑتا ہوا میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔

یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی دریا میلوں بلندی سے نیچے گر رہا ہو۔ اس آبشار کا دھانہ دریا کے پاٹ کی طرح بہت وسیع تھا۔

اور---- میں آنکھ جھپکے بغیر اس کا نظارہ کر رہا تھا۔

نیاگرا فال ایک طرح سے امریکہ اور کینیڈا کی سرحد بھی ہے۔ ایک حصہ امریکن نیاگرا اور دوسرا کینیڈین نیاگرا کہلاتا ہے عموماً یہاں آنے والے دونوں اطراف جاتے ہیں میرے لئے دوسری طرف جانے کا بندوبست سردار آتما سنگھ نے امریکہ پہنچنے کے بعد کروایا تھا جو اس کا کارنامہ ہے۔

○

کینیڈین حصے میں گرنے والی نیاگرا کا دھانہ امریکہ کی نیاگرا سے بھی زیادہ بڑا ہے اور اسے Horse Shoe فال کہتے ہیں۔ اس فال کے درمیان ایک پتھریلا جزیرہ موجود ہے جس کا نام "گوٹ آئس لینڈ" ہے کیونکہ ماضی میں یہاں بکریوں کی چراگاہیں تھیں اب اسے کینیڈین حکومت نے سیاحوں کی جنت بنا دیا ہے---

امریکن فال کی چوڑائی قریباً ایک ہزار فٹ اور کینیڈین کی چھبیس سو فٹ ہے۔

کینیڈین حصے پر چونکہ پانی زیادہ تیز رفتاری سے گرتا ہے اس لئے یہاں دھویں اور دھند کے بادل چھائے رہتے ہیں اور اس فال کا اصلی مزہ لینے کے لئے ہی مجھے ناظر سنگھ یہاں تک لایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم سب پلاسٹک کے کالے لبادوں میں ملفوظ تھے--- ربڑ کے جوتے ہم نے چڑھا رکھے تھے اور میں ایک ایسا سفر کرنے جا رہا تھا جو بہت کم سیاحوں کو نصیب ہوتا ہے۔ عام حالات میں بھی میں زندگی میں ایسا "تھرلنگ" پسند نہیں کرتا لیکن یہاں رزاق نے میری ہمت بڑھائی اور مجھے احساس بھی دلایا کہ ناظر سنگھ ہی ہمیں یہ سب کچھ کروا سکتا ہے اس سفر کے اخراجات عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم کہر کی دوشیزہ Maid of the Mist پر سوار ہو رہے تھے۔ اسٹک کی اس مضبوط کشتی سے ہمیں اس طرح باندھا گیا کہ اس کے الٹا ہونے کی ورت میں بھی ہم محفوظ رہتے۔

سفر کا آغاز ہوا ہم اس دھند کا نظارہ قریب سے کرنے جا رہے تھے۔ میرے ساتھ ے مہم جو جاپانی خاتون بڑی پرجوش دکھائی دے رہی تھی جبکہ میں سفر کے آغاز سے تام تک قرآنی آیات کی تلاوت دل ہی دل میں کرتا رہا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر امرت کور اس منظر کو فلما رہی تھی--- اس کا کیمرہ پروف ہو چکا تھا۔

پانی کی گڑگڑاہٹ، دھند، منجمد ماحول اور سیاہ بادلوں کے درمیان سے کشتی کو بڑے نہ انداز سے گزارتے ہوئے بخیر و عافیت واپس آ گئے۔

اگر ہم نے پلاسٹک کے یہ سیاہ لبادے زیب تن نہ کئے ہوتے تو شاید ہماری حالت ابیان ہوتی اب مجھے سمجھ آئی کہ یہ لباس ہم نے کیوں پہنے تھے۔

ڈرتے ڈرتے اس سفر کو میں نے طے کیا تھا لیکن اگر ایسا نہ کرتا تو شاید ساری

زندگی اس کا پچھتاوا ضرور رہتا کیونکہ مجھے دوبارہ امریکہ جانے کے باوجود نیاگرافال تک جانے کا کبھی موقعہ ہی نہیں مل سکا---

اب ہم لیک ایری Lake Erie کی طرف جا رہے تھے جہاں اونٹاریو سے کچھ دوست ہمارا استقبال کرنے کے لئے آگئے تھے۔

یہاں ہمارے لئے "لنگر" تیار تھا۔

سردار آتما سنگھ کا قبیلہ خاصا خوشحال تھا۔ یہاں ناظر سنگھ کی ایک بہن اور دو بھا رہتے تھے اور وہ سب اپنی فیملیز کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ ان کے بضد ہونے پر ہمیں ایک رات بادل نخواستہ اونٹاریو میں گزارنی پڑی کیونکہ سوا اس کے کوئی چا نہیں تھا۔

دوسرے روز واپسی کے سفر کا آغاز ہوا اور ہم فلورک کلارک loral Clock کا نظارہ کرتے ہوئے امریکن سرحدوں کی طرف مراجعت کرنے لگے۔ جس "پھو گھڑی" کا ذکر میں نے کیا اسے سجانے کے لئے کینیڈین گورنمنٹ نے چوبیس ہز رنگین پردوں کا انتظام کیا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ کبھی غلط وقت نہیں دیتی---

اس گھڑی کا ڈیزائن ہر سال تبدیل ہوتا ہے اور کبھی بھی پہلے والا کوئی ڈیزا نہیں بنایا گیا۔

یہاں سے چیل لیف ولیج گئے جہاں ہم نے "سیکرامنٹو رائڈ" لی اور سہ پہر کو دوبا امریکن سرحد میں داخل ہوگئے۔ جہاں اب آبشار پر رنگ برنگی روشنیاں پھینکی جار تھیں۔

یہ نظارہ بڑا دل کش تھا۔

پانیوں پر تیرتی روشنیاں دیکھ کر بے اختیار سبحان تیری قدرت الاپتے ہوئے درجنوں آبشاروں کا نظارہ کرتے رہے جو یہاں موجود ہیں۔

نیاگرافال کی سیر کے آخری مرحلے پر ناظر سنگھ ہمیں ہوائی غار Cave of the Winds میں لے آیا۔

یہ غار "سٹرز آئس لینڈ" میں موجود ہیں۔ ہمیں ایک مرتبہ پلاسٹک کے لباسوں میں ملفوف کر دیا گیا لیکن اس مرتبہ کالے کے بجائے پیلے لبادے تھے۔

انتظامیہ کے متعدد اہلکار ہمیں جلوس کی شکل میں "ورجن فال" لے گئے۔ جو چٹانوں کو تراش کر بنائی گئی تھی۔ اور اس غار سے گزر کر ہم آبشار کے بالکل نیچے پہنچ گئے۔

خدا کی پناہ---- ذرا چشم تصور سے نظارہ کیجئے کہ آپ نیاگرافال کے نیچے چل رہے ہوں تو آپ کی کیا حالت ہو گی----

چٹانوں میں بنی غار سے کہیں کہیں پانی گر کر ہمیں بھگو رہا تھا باقیوں کا حال تو میں نہیں جانتا البتہ میں بھیگی بلی بنا جلد از جلد اس ایڈونچر کے خاتمے کی دعا کر رہا تھا جبکہ رزاق اور سردار صاحبان اسے خوب انجوائے کر رہے تھے۔

اس سفر کا سب سے ہیبت ناک مرحلہ ورجن فال کے نزدیک لکڑی کے پل کا سفر ہے جس پر ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی چل سکتا ہے۔

آگے پیچھے سیاحوں کی قطار، تیز ہوائیں، پانی کی بوچھاڑ اور کانوں کے پردے پھاڑنے والی آبشار کا شور جواب ہماری آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ من چلے انہیں چھونے کے بھی خواہش مند تھے جبکہ ایسا بظاہر ممکن نہیں۔

میں دل ہی دل میں اس سفر کے خاتمے کی دعا مانگ رہا تھا خدا خدا کر کے ہوائی غاروں کا چکر مکمل ہوا اور ہم باہر آگئے۔

مقامی ڈائنرز سے کھانا کھایا واپسی کے لئے رخت سفر باندھا۔ رات ہم نے ناظر سنگھ کے ہاں اس کے بضد ہونے پر گزاری اور اگلے روز ناشتہ کرنے کے بعد ان تحفوں کے

ساتھ جن کو ناظر سنگھ کی بیٹیاں میرے لئے ساری رات باندھتی رہی تھیں۔

ڈاکٹر امرت کور کی دعاؤں اور ناظر سنگھ کے ساتھ دوبارہ ملنے کے وعدوں کے ساتھ رخصت ہوئے۔

مانا وہیں رہ گیا تھا رزاق اور میں زندگی کے شاندار تجربے کے بعد واپس لوٹ رہے تھے۔

رزاق نے اس مرتبہ روٹ تبدیل کر لیا تھا۔ مجھے "فلاڈلفیا" ڈراپ کرنے کے بعد وہ راتوں رات واپس چلا گیا۔

زندہ باد رزاق---- تمہارا بے حد شکریہ کہ تم نے مجھے نئے جہانوں کی سیر کروا زندگی کو نئے تجربات سے روشناس کروایا۔

امریکہ اور نیویارک کے بارے میں ذہن میں کئی تصورات قائم ہوتے تھے ایک تو ہ کہ امریکہ دنیا کی سب سے اہم جمہوری اور معاشی قوت ہے اور اس نے دنیا میں مہوری اقدار کے فروغ کے لئے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ امریکہ ایک سپر طاقت ونے کے ناطے میں امریکہ اور امریکی باشندوں سے خاصا متاثر تھا لیکن ذہن میں ریکہ کے بارے میں جو تصویر تھی وہ ساری محض تخیل کی پیداوار تھی نیویارک میں ھ عرصہ رہ کر امریکہ کی جو تصویر میں نے دیکھی اور محسوس کی وہ بڑی بھیانک ہے۔

نیویارک میں دو ماہ میں 20 سے زائد ٹیکسی ڈرائیوروں کو چند ڈالروں کی خاطر ت کے گھاٹ اتار دیا گیا یہاں انسانی جان کی قیمت نہ ہونے کے برابر ہے اور چند ڈالروں کی خاطر انسان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ نیویارک میں اپنے قیام کے دوران میں نے سڑک پر ایک پاکستانی نیوز ایجنٹ سے بس میں جانے کے لئے دس ڈالر کی چینج لی۔ یں رقم گن رہا تھا تو نیوز ایجنٹ نے جو پاکستانی تھے مجھے نصیحت کی کہ حضور رقم جیب میں ڈالیں ورنہ رقم تو جائے گی ہی جان سے بھی جاؤ گے یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں لوگ پنے پاس کیش نہیں رکھتے۔ مختلف قسم کے "کارڈز" سے کام چلاتے ہیں۔

امریکہ میں ہر شخص کو اپنے کام کا معقول معاوضہ ملتا ہے ایک گھنٹہ کام کی مزدوری نچ ڈالر سے کم نہیں اس کے باوجود امریکہ کی سماجی زندگی میں بڑھتے ہوئے جرائم دیکھ جمہوریت کے مستقبل سے انسان مایوس ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں ہر طرح کی آزادی

ہے لیکن اس کے باوجود امریکی تہذیب اور معاشرت جرائم کی طرف جس تیزی سے بڑھ رہی ہے وہ یقیناً میرے لئے ایک سوالیہ نشان تھا امریکی ٹیلیویژن کا رویہ بھی اسی طرح کا ہے آدھ گھنٹہ کی خبروں میں پہلے بیس منٹ کی خبریں جرائم اور عدالتوں کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہیں اور باقی پانچ منٹ بین الاقوامی خبروں کے لئے ہیں اور خبروں کی ترجیح میں انٹرنیشنل حالات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ لندن اور نیویارک میں زیرزمین ٹرین کے ذریعے سفر کا اتفاق ہوا لندن اور پیرس کا زیرزمین نظام انتہائی صاف ستھرا ہے اور زیرزمین سفر کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن نیویارک کا زیر زمین نظام جسے سب وے (Subway) کہتے ہیں انتہائی گندہ ہے اور اس نظام میں سفر کرتے ہوئے بدبو اور گھٹن کا احساس ہمیشہ رہتا ہے۔

○

شام رزاق کے ساتھ میں اس کے گھر کے قریب ساحل سمندر پر چلا گیا اس علاقے کو "براہٹن بیچ" کہتے ہیں۔ ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت ساحل سمندر پر موجود تھی۔ ہم کافی دیر تک ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتے رہے۔ اور سمندر کے ساتھ وہاں موجود لوگوں کا مشاہدہ کرتے رہے۔ ساحل سمندر پر موجود ہر شخص دنیا کو بھول کر صرف اسی ایک لمحے کے لئے جی رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ وہ لوگ زندگی کے اس لمحے کو آخری لمحہ سمجھ کر اس سے پورا پورا لطف اٹھانے میں کوشاں ہیں۔

ان لوگوں کا زندگی کا اپنا فلسفہ ہے ہم اپنے لئے نہیں بلکہ ساری زندگی دوسروں کے لئے جیتے ہیں۔ کبھی اولاد کے لئے کبھی بھائیوں کے لئے کبھی ماں باپ کے لئے لیکن ہمارے سماج اور سوسائٹی میں عدم تحفظ اور سوشل سیکورٹی نہ ہونے کی وجہ سے ہم ہمیشہ آنے والے لمحے کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں اور گزرنے والے لمحے کو بھول جاتے ہیں جبکہ مغرب میں لوگ صرف آج کے لئے جیتے ہیں انہوں نے کل کا

انتظار کبھی نہیں کیا اور کل کے بارے میں سوچ کر اپنی صحت خراب نہیں کرتے خاص طور پر ویک اینڈ پر تو یہ کبھی نہیں سوچتے۔

ہمارے ہاں ہفتہ وار چھٹی کو اہل خانہ گھر کا سودا سلف لانے اور جمعہ بازار کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں جبکہ مغرب کے لوگ ہفتہ اتوار کو چھٹی کے دو روز گھر میں نہیں رہتے اور گھر سے باہر سیر کے لئے نکل جاتے ہیں۔

سارا ہفتہ ویک اینڈ کی پلاننگ کرتے ہیں۔ ساحل سمندر پر آدھے ننگے مردوں اور عورتوں کے اس جنگل سے میرا دل جلد ہی اکتا گیا۔ (بعد میں تو اس کی جیسے عادت سی ہو گئی تھی) اپنے میزبان کے ہمراہ براہٹن بیچ پر واقع مچھلیوں کا چڑیا گھر دیکھنے گئے اس کا نام Aquarium ہے یہاں دنیا بھر کی ہمہ قسم مچھلیاں موجود ہیں اس کے علاوہ ایک گھنٹے کا مچھلیوں کا سرکس تماشہ بھی دکھایا جاتا ہے۔ اور مچھلیاں انسانوں کی طرف مختلف قسم کی بازی گری کے کمالات دکھاتی ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان مچھلیوں کو انتہائی مہارت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے ایک مچھلی کا وزن 1300 پونڈ ہے لیکن وہ اپنے کرتبوں سے تماشائیوں کو مبہوت کر دیتی ہے۔ ساحل سمندر گھومتے اور Aquarium میں جانے کی وجہ سے ٹانگوں میں مزید گھومنے کی سکت نہیں تھی اس لئے شام ڈھلے گھر واپس لوٹ آئے۔

اگلے دن نیویارک میں واقع امریکن نیچرل ہسٹری کے میوزیم دیکھنے گئے نیویارک سٹریٹ 81 کے انڈر گراؤنڈ سب وے سٹیشن کے بالکل اوپر یہ عجائب گھر واقع ہے۔ اس عجائب گھر میں انسان۔ زمین نباتات اور حیوانات کی ترقی کے مختلف مدارج کی صورت تصویریں موجود ہیں۔ یہ جانور 40 فٹ تک بلند ہیں اور تقریباً 80 فٹ تک لمبے ہیں اور ان ڈھانچوں کو دیکھ کر زمین کی ابتدائی مخلوق کے بارے میں ابتدائی تصویر واضح ہو جاتی ہے۔

اس عجائب گھر میں ایشیا، افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیا کی قدیم تہذیبوں کی قدیم اور ابتدائی تصویریں موجود ہیں۔ لیکن اس عجائب گھر میں رکھی ہوئی کئی اشیاء کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ آج جن اشیاء کو امریکیوں نے عجائب گھروں کی زینت بنالیا ہے ہم ابھی تک پاکستان کے دیہاتوں میں اس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری زراعت ابھی تک عجائب گھر میں رکھے ہوئے ہلوں کی مدد سے کی جارہی ہے۔ ہماری آبپاشی ابھی تک عجائب گھر میں رکھے ہوئے ماڈل کنویں سے کی جارہی ہے۔

میوزیم میں امریکہ کی ترقی اور اپنی قدامت پرستی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے کہ ہمارے دیہاتی آج تک جدید سائنسی ترقی سے نابلد ہیں۔ اگر امریکی ہمارے دیہاتوں کو دیکھیں تو انہیں شاید ایسے سینکڑوں میوزیم اور بنانے پڑیں عجائب گھر سے فارغ ہو کر انڈر گراؤنڈ ٹرین سے امپائر سٹیٹ بلڈنگ پہنچے یہ عمارت انتہائی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ امریکہ کی چند اور نیویارک کی دوسری بلند ترین عمارت ہے۔ اس عمارت سے نیویارک کا نظارہ دیدنی ہے امپائر سٹیٹ بلڈنگ دنیا کی خوبصورت ترین عمارات میں شامل ہوتی ہے اس کا تعارف تو میں آپ سے پہلے بھی کروا چکا ہوں۔

نیویارک شہر کی سٹریٹ 34 اور ففتھ ایونیو پر واقع اس عمارت کا ڈیزائن عالمی شہرت یافتہ فرم شریو۔ لیمپ اور حرمن ایسوسی ایٹ کا تیارہ کردہ ہے یہ عمارت 1931ء میں مکمل ہوئی اور دنیا کی پہلی عظیم عمارت کا اعزاز اسے حاصل ہے۔ عمارت کو باہر کی طرف چونے کا پتھر اور گرینائٹ لگایا گیا ہے۔ رات کو عمارت کی روشنی اور چاند کی روشنی میں لوگ خاص طور پر اس عمارت کو دیکھنے آتے ہیں۔ یہ عمارت 102 منزل بلند ہے اور اس کی اونچائی 1454 فٹ ہے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کے سامنے میکڈونلڈ میں ہلکا پھلکا لنچ کیا اور گھر کی راہ لی۔

○

امریکہ میں آنے والے لوگوں کے لئے امریکہ کا مجسمہ آزادی انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور اس مجسمہ کو دیکھنے کے لئے سیاح ہزاروں کی تعداد میں روزانہ یہاں آتے ہیں۔ مجسمہ آزادی یا Statue of Libery نیویارک سے ملحقہ ایک چھوٹے سے جزیرے پر نصب ہے۔ اس مجسمہ آزادی پر پہنچنے کے لئے مین ہیٹن سے ایک چھوٹے شپ کے ذریعے اس جزیرے پر پہنچے انتہائی خوبصورت چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اور اس جزیرے کے درمیان میں مجسمہ آزادی نصب ہے جو دنیا بھر میں آزادی اور جمہوریت کی علامت ہے۔ یہ مجسمہ آزادی فرانس کا امریکہ کو تحفہ ہے ----

یہاں میرے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جسے میں ساری زندگی فراموش نہیں کر سکتا۔ اصل میں یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہی کسی قوم کی عظمت یا ذلالت پر دلالت کرتے ہیں "لبرٹی ویلج" جانے والوں میں میرے دوست مان سنگھ کی بھتیجی بھی شامل تھی۔ یہ دس سال کی بچی ضد کر کے ہمارے ساتھ شامل ہوئی تھی کیونکہ ابھی تک اس نے لبرٹی ویلج نہیں دیکھا تھا۔

اس روز بدھ کا دن تھا۔

جب ہم چھوٹے جہاز "فیری" میں سوار ہوئے تو میں نے خاص طور سے یہ بات نوٹ کی کہ کچھ امریکی بچی کی طرف محبت سے اور ہماری طرف غصے سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اس کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

لیکن ----

میرے دوست کو سمجھ آگئی۔

اس نے بتایا کہ دراصل یہاں تصور نہیں کیا جاتا کہ کوئی بچہ سکول سے بلا جواز چھٹی کرے آج چونکہ ڈے آف نہیں اور ہم سکول کی ایک طالبہ کو اپنے ساتھ لے ئے ہیں۔

اس لئے یہ لوگ برامنا رہے ہیں----

آپ نے اندازہ فرمایا کہ اس ملک میں تعلیم اور خصوصاً بچوں کی تعلیم کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔

اور ایک ہم ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے بچے سکول کے اوقات میں گلیوں، بازاروں، میدانوں میں آوارہ گھومتے رہتے ہیں اور ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

شاید ہم نے تعلیم کو کوئی اضافی چیز سمجھ رکھا ہے----اگر کبھی مہلت مل گئی تو بچوں پر بھی توجہ فرمالی۔ ورنہ اللہ اللہ خیر صلا۔

فلاڈلفیا سے ہم ایک مرتبہ پھر نیویارک جارہے تھے----!

طاہرہ گاڑی ڈرائیو کررہی تھی اور میں ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اس کے ساتھ والی سیٹ پر اس کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا---

پچھلی سیٹ پر رابعہ نے ادھم مچا رکھا تھا۔ جب تک رابعہ اور نمیر جاگتے رہیں زندگی بیدار رہتی ہے۔

جیسے ہی انہیں اونگھ آئے۔

جیسے زندگی کو نیند آجاتی ہے۔

تب سڑک کے دورویہ لگے درخت اور مناظر زندہ ہونے لگے تھے۔ کیونکہ اپنی بیداری کے درمیان دونوں سوائے اپنے اور کسی کی طرف میری توجہ مبذول نہیں ہونے دیتے۔

"بن فرینکلن برج" پر طاہرہ کی سوبرو کاروں کے سمندر میں پھسل رہی تھی اور ننھی رابعہ "لندن برج اس ہینگنگ اور پھر جنگل بیل جنگل بیل" سنا رہی تھی۔

جیسے ہی میں طاہرہ کی کوئی بات سننے کے لئے اس کی طرف متوجہ ہوتا نمیر جو اپنی ننھی سیٹ میں پھنسا کھڑا ہوتا رابعہ کو چھیڑ دیتا اور وہ فوراً سراپا احتجاج ہو کر مجھے مدد کے لئے پکارنے لگتی۔

دونوں کی معصوم شرارتیں، شوخیاں زندگی کے ان یادگار لمحات میں سنگ میل

بنتی جارہی تھیں۔

نیو جرسی ٹرن پائیک میں گھستے ہی رابعہ نے آہستہ سے آگے ہاتھ بڑھا کر مجھے ٹھوکا دینا شروع کر دیا تھا اور میں اس کے مخاطب کرنے کے اس معصوم انداز کا مطلب بخوبی جانتا تھا۔

"اگلی سروس پر گاڑی ذرا روک لینا" میں نے طاہرہ سے کہا۔

"کیوں----؟" اس نے حسب معمول پوچھا۔

"ذرا ستالو---نیویارک میں ڈرائیونگ کرنا بچوں کا کھیل نہیں" میں نے اسے حسب سابق جواب دیا۔

"اس کے علاوہ تو کوئی بات نہیں"---اس نے ہائی وے پر نظریں جماتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"اس کے علاوہ تمہاری کوئی بات نہیں" میں نے جواب دیا۔

"انکل کہیں آپ دونوں کی بحث میں سروس ایریا نہ نکل جائے۔" رابعہ نے ہمارے سوال جواب کے درمیان مجھے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا۔

"چپ کر موٹیے مینوں پتا اے توں کس مصیبت دا شکار ایں"---طاہرہ اپنی بیٹی کو بڑے پیار سے ڈانٹتی ہے۔

ہم اب سروس ایریا میں داخل ہو رہے تھے۔

سروس ایریا آپ کو امریکہ میں ہائی وے کے کنارے ہر پانچ دس میل کے فاصلے پر ضرور مل جائیں گے۔

سنتے ہیں کہ شیر شاہ سوری نے جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ مسافروں کے ستانے کو آرام گاہیں اور سرائیں بنائی تھیں اب تو ان پر "قبضہ گروپ" قابض ہوگا جنہوں نے انہیں مارکیٹوں یا پلازوں کا روپ دے کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی ہوگی۔

میں امریکہ کے ان "سروس ایریا" کو دیکھ کر سوچا کرتا ہوں کہ تمام مسلمان بادشاہ بے وقوف نہیں تھے۔ انہیں بھی مستقبل کی ضرورتوں کا ادراک ضرور رہا کرتا تھا یہ الگ بات کہ آج ہم زیادہ عقلمند بن گئے ہیں اور صرف "حال" کے متعلق ہی سوچتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہے آج جی بھر کے موج میلہ کر لیا جائے۔ کل کس نے دیکھنا ہے۔

○

ان "سروس ایریا" میں سفر سے متعلق ہر ممکن سہولت موجود ہے--- پینے کے لئے ہمہ اقسام شرعی اور غیر شرعی مشروبات کے علاوہ کھانے ستانے اور تازہ دم ہونے کی تمام سہولیات میسر ہیں۔

"سروس ایریا" میں "Pizza Hut" دیکھ کر رابعہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی خواہ مخواہ بھوک محسوس ہونے لگی اور تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب قطار میں لگے ہوئے تھے---

ہم "وجیٹیرین پیزا" کے سلائس کاغذ کی پلیٹوں میں ہاتھوں پر رکھ کر باری باری اس موٹی سی نیگرو عورت سے اس طرح وصول کر رہے تھے جیسے ہمارے ہاں فقیروں میں خیرات بانٹی جاتی ہے۔

اپنے کالے ہونٹوں پر گہری سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائے اور پیلے اور سرخ پٹیوں والے لباس میں ملبوس موٹی نیگرس ہم میں سے ہر ایک کو بے نیازی کا انداز لئے یک نظر دیکھتی اور پیزا کاغذ کی پلیٹ میں رکھ کر ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ کر "گڈ ے" کہہ کر اپنے موتیوں جیسے چمکدار دانتوں کی نمائش کرنے لگتی---!

امریکی بچوں کی طرح رابعہ کی ڈیمانڈ بھی ہمیشہ "ایکسٹرا چیز" Chees کی ہوتی ہے جبکہ نمیرا ابھی تک پاکستانی ہے اور ہماری طرح موشروم اور تھوڑی "چیز" پر قناعت

کر لیتا ہے۔

اپنی اپنی نیاز ہتھیلیوں پر جمائے ہم زمین میں دھنسی میز اور اس کے گرد دائرے میں نصب گول کرسیوں پر ٹک گئے۔

طاہرہ سرخ مرچوں، گارلک پاؤڈر اور سالٹ کی بوتلیں اٹھا لائی تھی اور میں پیزے کے اس ٹکڑے کو "سپائسی" بنانے کے چکر میں اس وقت تک سرخ مرچوں کا چھڑکاؤ کرتا رہا جب تک کہ مجھے یقین نہ ہو گیا کہ اب ضرور پیزا کھاتے ہوئے میرے منہ سے "سوں سوں" کی آوازیں نکلیں گی----

رابعہ نے میری چوائس کا "لیمونیڈ" پہلے سے گاڑی میں رکھ لیا تھا جو عموماً ایسے ہی موقعوں پر میرے کام آیا کرتا ہے----

ہمارے اردگرد سینکڑوں لوگ اس بڑے ہال کے مختلف کونوں میں جہاں امریکن "فاسٹ فوڈ" اور "سی فوڈ" کے سٹال سجے تھے ساری دنیا کے غموں سے بے نیاز کھانے میں مگن تھے----!!

ہم اکثر اپنے شادی بیاہوں اور ضیافتوں کے دیگر مواقع پر اس بات کے ش رہتے ہیں کہ ہم بے تحاشہ کھاتے اور ضائع کرتے ہیں۔

لیکن----!

امریکیوں کو اگر آپ کھاتے دیکھ لیں تو اپنا خیال بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بھی فاسٹ فوڈ پر چلے جایئے ہر شخص اپنے سامنے رکھے ٹرے اور اشیائے خورد و نو ڈھیر لگائے بیٹھا ہے۔ جتنی کھانے پینے کی اشیا ہیں اتنے ہی نیپکن بھی ساتھ رکھتے ہیں

تھوڑی دیر بعد جب طبیعت سیر ہو جائے گی تو ٹرے پر رکھا سارا کھانا ا "ٹریش" ہو جائے گا اور ٹرے ایک سائیڈ پر رکھ دی جائے گی مجھے کچھ خاص ان دعویٰ تو نہیں۔

لیکن----

میرا دل کہتا ہے کہ اگر وہ سارا فوڈ جو ایک دن میں "امریکی میکڈانلڈ" "رائے روجرز" "ہارڈی" "برگر کنگ اور "ٹاکو بیل" ہی میں "ٹریش" کر دیتے ہیں وہ اتنی مقدار میں ہوتا ہے کہ اس سے ساری نہیں تو آدھی دنیا کے بھوکوں کا پیٹ بخوبی بھر سکتا ہے۔

ایتھوپیا کا قحط ختم ہو سکتا ہے۔

تیسری دنیا کا ہر باشندہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! ہم کیا کھانا ضائع کرتے ہیں کھانا تو امریکن کھاتے ہیں کہ کھانے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

○

نیویارک کی طرف رینگنے والوں کے سمندر میں طاہرہ بڑے اعتماد سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

دونوں بچے اپنی سیٹوں پر خراٹے لے رہے تھے----!

میں سڑک کے دورویہ درختوں کی قطار اور ان کے پیچھے موجود درختوں کے سلسلوں میں بھٹکنے لگا---

سارے درخت شاہ بلوط کی طرح لانبے اور گہرے سبز رنگ کے تھے کیا مجال کہ ان پر کہیں گرد یا دھواں جما ہو--- خدا جانے سارے جہاں کا گرد اور دھواں ہمارا ہی نصیب کیوں بن گیا ہے۔

جتنی کاریں سارے لاہور میں چیختی چنگھاڑتی ہیں صرف بروک لین میں اس سے زیادہ کاریں رینگتی ہوں گی۔

لیکن----!

ان کے سائیلنسروں کی چنگھاڑیں نہیں گونجتیں۔ دھواں نہیں نکلتا خدا جانے یہ

دھواں کہاں منجمد ہو جاتا ہے۔ دھواں شاید امریکنوں کے اندر جمتا رہتا ہے اسی لئے تو
امریکن بہت روتے ہیں----!

کوئی خوشی کا موقعہ ہو کوئی غمی کا موقعہ ہو---رونے لگتے ہیں---اپنے اندر کے
غبار کو ہلکا کرنے کے لئے نکالنے کے لئے۔ اگلی سڑکوں پر ٹریفک کا حال جاننے کے لئے
شاید طاہرہ نے کار ریڈیو کا کوئی بٹن دبایا تھا جب اچانک ہی ایک گیت نے مجھے اپنی طرف
متوجہ کر لیا۔

I am alian

I am an English man

I am stranger in newyork

یہ لائنیں بہت دیر تک میرے دماغ میں گونجتی رہیں چونکہ میں اس سے پہلے بھی
دو تین مرتبہ نیویارک یاترا کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ یہاں کی سڑکوں پر انسانوں کے ریلے
میں ایک اجنبی کے احساسات کیا ہو سکتے ہیں!!!

طاہرہ نے دوسرا اسٹیشن بدلا!

کوئی گہری اور پرسکون آواز والی مغنیہ کہہ رہی تھی۔

"Open your wings and fly"

○

ہماری کار ہالینڈ ٹنل میں داخل ہو رہی تھی----

جرسی اور نیویارک کو ملانے والی اس طویل سرنگ کے باہر کاروں کی لمبی قطاریں
موجود تھیں۔

ہم بھی ایک ایسی قطار میں لگ گئے!

کیا مجال جو کبھی کسی نے کسی کا حق مارا ہو!

کیا مجال جو کوئی کسی کے راستے کی دیوار بنا ہو!

یہ دنیا کے مصروف ترین لوگ تھے۔

اور ہم شاید فارغ ترین----

آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہو گا کہ ایک سیاح نے دنیا کے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی
اور اپنا سفر نامہ لکھا جس کی خوبی یہ تھی کہ وہاں ہر ملک کے لوگوں کے عادات نفسیات
اور مسائل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

موصوف پاکستان کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں پاکستان کے شہر لاہور کی
مصروف شاہراہ مال روڈ کے ریگل چوک میں پہنچا جہاں ایک ہجوم اکٹھا تھا----میں
نے ایک صاحب سے استفسار کیا--

کیا بات ہے یہاں اتنا مجمع کیوں لگا ہے؟

انہوں نے فرمایا کہ ابھی دو آدمیوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا وہ کہاں گئے۔

ان صاحب نے فرمایا کہ وہ دونوں تو کبھی کے چلے گئے یہ تو وہ لوگ ہیں جو تماشا
دیکھنے جمع ہوئے تھے۔

ممکن ہے اس حکایت میں کچھ مبالغہ رہا ہو۔

لیکن---

یہ حقیقت کے قریب ترین حکایت ہے۔ واقعی ہم لوگ اتنے ہی فارغ ہیں۔ آج
بھی ہمارے شہروں میں کوئی بھی مداری ڈگڈگی بجا کر سو دو سو کا مجمع اکٹھا کر سکتا ہے۔
اور اگر آپ کو ڈھنگ سے ڈگڈگی بجانا آجائے۔ آپ بندروں کا تماشہ دکھانے
ں کمال حاصل کر لیں تو یہی تعداد پھر سینکڑوں سے ہزاروں اور کئی کئی لاکھوں میں
چ جاتی ہے اور ان لاکھوں جمع ہونے والوں کو علم ہی نہیں ہو پاتا کہ کب تماشا شروع

ہوا، کب ختم ہو گیا----

بے چارے ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے دیکھتے رہتے ہیں اور

ع...... تماشا دکھا کر مداری گیا

کے مصداق مداری صاحب جو کوئی نہ کوئی سیاسی یا مذہبی نعرہ لگا کر مجمع اکٹھا کرتے ہیں۔ مطلب نکل آنے پر چپ چاپ اپنا راستہ ناپتے ہیں اور بے چارے پھر تبصرے کرتے یا کڑھتے رہتے ہیں۔

پاکستانی مداریو خدا تمہیں سمجھے۔

خدا کرے جلد تم مکافات عمل کی گرفت میں آ جاؤ پھر ہم دیکھیں گے تمہاری ہوشیاریاں چالبازیاں اور مکاریاں تمہیں کس طرح بچا سکیں گے----

خدا وہ دن جلد لائے جب ہم تمہارے حال پر ہنسیں۔

جس طرح آج تم ہمیں بے وقوف بنا کر اپنی نجی محفلوں میں ہم پر ہنستے ہو۔

○

ہالینڈ ٹنل کے باہر ہر کوئی جلدی میں تھا۔

لیکن----

کسی کو جلدی نہیں تھی۔

کوئی افرا تفری کا مظاہرہ نہیں ہو رہا تھا۔

ہر کوئی اپنی باری آنے پر ہی آگے بڑھتا تھا اور اس ترتیب اور تنظیم کی وجہ سے جلدی ہی سب کی باری بھی آ گئی۔

مین ہٹن کی پندرہویں سٹریٹ پر بے چینی سے روپ ہمارا منتظر تھا۔

ڈاکٹر گریوال نے روپ کو فون کر کے صرف اتنا بتایا تھا کہ ساگر صاحب اور بچے آ رہے ہیں نہ تو اس بے چارے کو ہمارے وقت کا علم تھا نہ ہی اندازہ بس یونہی اس نے

سوچا کہ ہم تین چار بجے تک پہنچ جائیں گے اور ہم پہنچ بھی گئے---

رابعہ اور نمیر کی آنکھ کھل گئی تھی۔

دونوں بچے کھلی آنکھوں سے کبھی روپ کو اور کبھی میری طرف دیکھ رہے تھے کہ یہ کون سا اجنبی میرے اور ان کے درمیان آ گیا۔ میں نے روپ کا تعارف ایک دوست کی حیثیت سے کروایا اور بچوں کو بتایا کہ اب یہی ہمارے ہوسٹ بھی ہیں---"پہلے کہاں چلیں گے۔"

روپ نے اپنے کمپارٹمنٹ میں ہمارے سامنے امریکن سٹائل کا ڈنر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے آرام کریں گے"

"ایمپائر سٹیٹ"

میں نے پہلی اور رابعہ نے دوسری چوائس چھٹتے ہی بتائی۔

میں نے تو آرام کا مشورہ طاہرہ کے لئے دیا تھا جو یہاں تک ڈرائیونگ کرتی آئی تھی۔

لیکن----

یہ میرا حسن ظن تھا کہ وہ تھکی ہوئی ہے حالانکہ وہ تازہ دم۔

ع...... چلنے کو تیار بیٹھے ہیں۔

کے مصداق ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

ہم دونوں معمول کے مطابق بحث کرنے لگے میں اسے اپنی اور وہ مجھے اپنی بات منوانے پر تلی تھی۔

"میرے پاس ایک تجویز ہے جس سے آپ دونوں مطمئن رہیں گے"----

روپ کے صبر کا پیمانہ چھلکا----

"کیا؟"

میرے بجائے رابعہ نے پوچھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جب تک ہم دونوں کے پاس

موجود دلائل ختم نہیں ہوں گے ہم بحث میں لگے رہیں گے۔

"اس وقت پانچ بجے ہیں ہم سات بجے چلیں گے۔ ایمپائر سٹیٹ"----

"یار وہ دیکھی ہوئی ہے۔" میں نے درمیان سے اس کی بات ٹوک دی۔

"جی ہاں دن میں--- لیکن رات کو اس کے دیکھنے کا مزہ ہی اور ہے"---روپ نے مجھے مطمئن کیا۔

رابعہ اور طاہرہ نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملادی نمیر میرا اور میں اس کا منہ دیکھنے لگے۔

فلم ایکٹر طالش جیسے پھولے ہوئے گالوں والے ننھے نمیر کو میں نے گود میں اٹھا کر اس کے گالوں پر دو زبردست بوسے دے کر اس کی خاموش حمایت کا شکریہ ادا کیا اور

ع...... سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کہہ کر روپ کی طرف دیکھتے ہوئے ہتھیار پھینک دیئے۔

○

نیویارک کے ففتھ ایونیو کی 34ویں سٹریٹ پر واقع ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو رات میں دیکھنے کا تجربہ میری زندگی کا شاندار اور ناقابل فراموش تجربہ ثابت ہوا۔

روپ اپنی لنکن میں بیٹھا کر ہمیں یہاں تک لایا تھا۔ اس کے گھر سے یہاں تک میں خود کو لنکن کے گداز گدوں والی سیٹوں میں دھنستا محسوس کر رہا تھا----

ٹکٹ خرید کر ہم لوگ لابی میں پہنچ گئے----

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی لابی آرٹ کے خوبصورت شاہکاروں سے مزین ہے جرمن بلجیم اٹلی اور فرانس کی پہاڑیوں سے تراشے گئے سنگ مرمر کا بہترین استعمال اس لابی میں دیکھنے کو ملتا ہے---گو کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر، کینیڈی سنٹر اور نیویارک کی کچھ اور عمارتوں میں بھی یہی خوبصورت اور قیمتی پتھر استعمال کیا گیا ہے۔

لیکن----

اس لابی کی ایک خصوصیت جو اسے دیگر عمارتوں کی لابیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہاں "رائے سپار کیا" اور اس کی آرٹسٹ بیوی کی شاندار پینٹنگز ہیں۔ جو لابی میں چاروں طرف دیوار میں بجی ہر آنے والے سے اپنا آپ منواتی اور خراج تحسین حاصل کرتی ہیں۔

میں اس سے پہلے دن میں یہاں آچکا تھا۔

لیکن----

یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رات کو یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد دن میں آنے والوں سے زیادہ نظر آ رہی تھی۔

شاید اس کی وجہ "ویک اینڈ" بھی ہو کیونکہ آج ہفتے کی رات تھی۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ میں یوں تو 73 تیز رفتار لفٹیں لگی ہیں جو پلک جھپکتے میں آپ کو 320 میٹر کی بلندی پر لے جاتی ہیں۔

لیکن----

ان لفٹوں کے سامنے اکثر قطار لگی نظر آتی ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہاں آنے والوں کی تعداد کیا ہوتی ہو گی۔ ایک اندازے کے مطابق 50 لاکھ افراد الانہ ان لفٹوں کے ذریعے ایمپائر سٹیٹ پر جاتے ہیں----

ہم بھی "کیو" میں لگ گئے----

چند منٹ بعد ایک تیز رفتار لفٹ ہمیں بلڈنگ کی 46ویں منزل پر لے گئی یوں تو پائر بلڈنگ کی اوپر کی 30 منزلوں کو بھی رات کے 9 بجے سے 11 بجے تک رنگ و نور روشنیوں کے سیلاب میں نہلایا جاتا ہے اور ان لمحات میں یہ بلڈنگ نیویارک کی دیگر نگوں میں بالکل اس طرح سجی دھجی نظر آتی ہے جیسے اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ دلہن---

46ویں منزل پر قدم رکھتے ہی آنکھیں خیرہ ہونے لگی تھیں----!!

ونڈر فل---سپلنڈڈ---سبحان اللہ۔ میرے منہ سے بے ساختہ نجانے کیا کیا نکل رہا تھا۔

بے اختیار میری زبان اس منظر کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی۔

لفٹ سے باہر نکلتے ہی یوں لگا جیسے میں روشنی اور رنگوں کے کسی خوبصورت جزیرے پر اتر گیا ہوں----

میرے چاروں اطراف آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی رنگ برنگی روشنیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

بالکنی کے مختلف کونوں میں نصب طاقتور دور بینوں میں کوارٹر (امریکی چونی) ڈالنے سے آپ چند منٹ تک ارد گرد کا نظارہ کر سکتے ہیں۔

ان دور بینوں کے لئے بھی ہمیں "کیو" میں کھڑا ہونا پڑا اس ضمن میں عقلمندی یہ ہوئی کہ ہم نے ایک ہی جگہ کھڑے ہونے کے بجائے تین مختلف قطاروں میں اپنے لئے جگہ بنائی۔

بمشکل پانچ چھ منٹ بعد ہی میری باری آئی اور جیسے ہی سکہ ڈالنے پر دور بین ان ایکشن ہوئی میں نے اسے نادیدہ بچوں کی طرح چاروں طرف گھمانا شروع کر دیا۔

چاروں طرف میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگ پھلجھڑیاں پھوٹ رہی تھی۔

کہیں یہ روشنیاں مجھے اپنے پہلو سے اور کہیں زمین سے پھوٹتی دکھائی دیتیں اور پھر آسمان تک پھیلتی چلتی جاتیں۔

تاحد نگاہ رنگ و نور کا ایک سیلاب بیکراں تھا کہ جس میں میں بھی بہتا جا رہا تھا۔

نیویارک کے بڑے بڑے پلوں پر لرزتی روشنیاں----

ایمپائر سٹیٹ کے دائیں بائیں پھیلتی آسمان کی بلندیوں کو چھوتی بلڈنگوں سے

چنگاریں پھوٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔

ائرپورٹ پر لینڈ کرتے اور چڑھتے جہازوں کی دم سے آگ نکلتی تھی اور سمندر میں کھڑے دیو ہیکل جہاز جو یہاں سے معمولی کشتیاں دکھائی دیتے تھے کے سروں پر موم بتی کی لو کی طرح روشنیاں لہرا رہی تھیں۔

روشنیوں کا ایک جہان میرے چاروں طرف آباد تھا۔

میں اب تک تین مرتبہ دور بین میں سکے ڈال کر اس منظر سے لطف اندوز ہو چکا تھا---

میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ خوبصورت خواب ٹوٹ جائے جس میں میرا وجود فضائے بسیط کی بیکراں وسعتوں میں اڑتا چلا جا رہا تھا---

میرے تن سے آزاد ہو کر میری روح نے ایک خوبصورت سفید پرندے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بالکل ویسے ہی خوبصورت ننھے ننھے سفید پروں والے فرشتے جیسی جو کرسمس کے کارڈوں پر بنے ہوتے ہیں---!

اس لمحے مجھے طاہرہ کی کار میں بجنے والے اس گیت کی لائن یاد آگئی جس میں کوئی منچلی مغنیہ مجھے کہہ رہی تھی۔

Open your wings and fly.

اور میں سوچ رہا تھا۔

زندگی کے اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں۔ خوشیوں اور مسرتوں کے کتنے بے شمار جزیرے ہیں جو مجھے اپنی سمت بلا رہے ہیں۔

لیکن----

میں تہی دست---اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتا تھا کہ ان خواب جزیروں تک اڑ کر پہنچ سکوں جہاں خوشیاں میری منتظر تھیں----

اس لمحے مجھے ادراک ہوا کہ انسان واقعی ناشکرا ہے---نا مطمئن اور اپنے ہی پیدا کردہ آسیبوں میں گھرا ہے بس انسان اپنے لئے کتنے دکھ مصیبتیں اور بے قراریاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے----

قدرت کی عطا کردہ نعمتوں پر شاکی رہنے والا انسان نہیں جانتا کہ زندگی کا دامن خوشیوں سے لبالب بھرا ہے اور اس کی تنگ نظری نے اس کا دامن بھی اتنا تنگ کر دیا ہے کہ اپنے حصے کی خوشیاں بھی ڈھنگ سے حاصل نہیں کر پاتا۔

بس کر جاؤ بابیو! مچھلیاں تے رحم کرو"--- میرے تعاقب میں ابھرنے والی روپ کی آواز نے خواب جزیرے سے اٹھا کر مجھے پھر اس مرتی مارتی دنیا میں لا پھینکا۔

مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میرے پیچھے لگی قطار لمبی ہوتی جا رہی ہے۔

"کچھ انجوائے بھی کیا"--- طاہرہ نے پوچھا جو میری طرح ابھی اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد ادھر آئی تھی۔

"ہاں بہت کچھ"--- میں نے کہا---"طاہرہ! خوشیوں اور آگہی کے لمحات ہمیشہ مختصر ہوتے ہیں لیکن بڑے پائیدار اور جاں فزا----"

"کج ساڈے پلے وی پاؤ بابیو" روپ نے مجھے سیریس دیکھ کر ماحول بدلنے کی کوشش کی۔

جے میں ویکھاں اپنے ولے
کجھ نئیں میرے پلے
جے میں ویکھاں تیرے ولے
بلے بلے بلے----!!

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ پر کھڑے اس لمحے نجانے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا--

روپ سنگھ نے ان لائنوں کو بہت انجوائے کیا---

ہمارے شمال کی جانب مشہور عالم راک فیلر سنٹر تھا جو اپنی بہت سی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خاص بات کے لئے بھی شہرت رکھتا ہے کہ کرسمس کے موقعے پر یہاں سے بہت بڑا کرسمس ٹری برآمد ہوتا ہے---

اس روایتی درخت کو دیکھنے کے لئے جس کے ساتھ ہزاروں روشنیاں چھوٹی چھوٹی مرچوں کی طرح ٹمٹا رہی ہوتی ہیں لاکھوں تماشائی ارد گرد گلیوں اور بازاروں میں بیٹھے ہوتے ہیں اور اس درخت کی روشنیاں جب باہر نکال کر جلائی جاتی ہیں تو ساری فضا تالیوں اور خوشیوں کے نعروں سے گونج اٹھتی ہے۔

یہاں سے برآمد ہونے والا کرسمس ٹری نزدیک ہی "سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل" پر لایا جاتا ہے۔

راک فیلر کے شمال میں نیویارک کا مشہور سنٹرل پارک اور جنوب میں نیویارک پبلک لائبریری موجود ہے۔

سنٹرل پارک کی مغربی سمت میں نیویارک کلوزیم اور لنکن سنٹر اور پارک کے شمال کی سمت میں ذرا آگے میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹس۔

یہ عمارات نیویارک کی 57 سٹریٹ سے 72 ویں سٹریٹ تک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔

69 ویں سٹریٹ سے 96 ویں سٹریٹ تک تمام علاقہ "براڈوے" ہے۔اور یہ براڈ وے سنٹرل کے متوازی چلتی چلی جاتی ہے۔اس سمت میں ہی آگے مشہور زمانہ کولمبیا یونیورسٹی آجاتی ہے۔

روپ کو تو جیسے نیویارک کا سارا جغرافیہ حفظ تھا۔میں اور طاہرہ اس کا منہ دیکھ رہے تھے اور دونوں بچے ہماری طرف متوجہ تھے---!

وہ جو سامنے روشنیوں کا پنگھوڑا جھول رہا تھا وہ دریائے ہڈسن پر بنا جارج واشنگٹن

برج ہے جہاں اکثر ٹریفک سٹک Stuck ہو جاتی ہے اور اس کے شمال میں بالکل برونکس کے اندر یانکی سٹیڈیم---!

"کجھ پلے وی پے رہیا جے مہاراج"---اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر نمیر کے ہاتھ میں پکڑے چپس کے پیکٹ سے کچھ چپس نکال کر منہ میں ڈالے اور دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

"پہلے اپنی مونچھیں صاف کرلو"--- میں نے جیب سے نیپکن نکال کر اسے تھمادیا۔

"شکریہ میاں جی"---کاغذ کا نیپکن تھامتے ہوئے پنجاب کے جیالے جاٹ نے قہقہہ لگایا۔

"ہمارے ایسٹ میں پین ایم بلڈنگ تو آپ لوگوں کو نظر آ ہی رہی ہے جس پر جلتی روشنیوں میں پین ایم لکھا ہے----"

"یار جو ہمیں نظر آرہا ہے وہ بتانا کیا ضروری ہے۔ بس یہی کمی ہے تم لوگوں میں" میں نے کہا۔

"اچھا شکر اے رب دا ساڈے ویرے نے آخر عینک دا نمبر بدلا ای لیا۔" وہ بھی کہاں چپکا بیٹھنے والا تھا۔

پین ایم کے پہلے گرینڈ سنٹرل ٹرمینل کا ایک کونا جگمگا رہا ہے۔ مشرق میں کرسلر بلڈنگ سے آگے جو ٹاور دکھائی دے رہا ہے وہ یو این او جنرل اسمبلی کا ٹاور ہے۔ اور اس کے آگے جو قوس و قزح پھوٹ رہی ہے وہ روز ویلسٹ کا جزیرہ ہے جس پر کوئیز برو برج ایستادہ ہے۔

اس کے شمال میں بہت دور ٹرائے برو برج جس "ایسٹ ریور" پر بنا ہے اس میں "وارڈ آئی لینڈ اور رینڈلز آئی لینڈ" کے خواب جزیرے آباد ہیں جو امریکن کروڑپتیوں

کے مسکن ہیں۔

"ٹرائے برو برج" "برونکس" کو کوئینز سے اور "کوئینز برو برج" پھر مین ہٹن اور کوئینز کے درمیان رابطہ قائم رکھے ہوئے ہے----!

"اور وہ جو سامنے ایئرپورٹ نظر آرہا ہے"----

"جے ایف کینڈی ہوگا"----میں نے اس کی بات کاٹی۔

"اب تم ہمارے والی غلطی دہرا رہے ہو--- میاں صاحب جس بات کا پتہ نہ ہو پوچھ لیا کرتے ہیں یہ "لوگارڈیا ایئرپورٹ" ہے----"

جے ایف کینڈی نہیں اس کی باری آئے گی تو بتادوں گا۔

"اچھا اچھا---بس زیادہ قابلیت نہ جتایا کرو بچوں کے سامنے"---

میرے اور روپ کے درمیان خاصی بے تکلفی پہلے سے قائم تھی۔

"اب ذرا اس طرف آجاؤ یہ بالکونی کی جنوبی سمت ہے"--- اس نے ہمیں دوسرے کونے میں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ہاتھ کی انگلی سے سامنے اشارہ کرنے لگا۔

اس طرف میٹروپولیٹن لائف بلڈنگ، میڈیسن سکوئر پارک اور ٹوائے سنٹر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہیں اور ان کے آگے نیویارک بائف بلڈنگ ہے۔

"اور وہ گرینج ویلج"---میں نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

طاہرہ نمیر کو باتھ روم میں لے گئی تھی اور ہم دونوں اکیلے ہی یہاں کھڑے تھے۔

"بڑا شوق ہے دیکھنے کا---واشنگٹن سکوائر کے جنوب مغرب میں ہے تمہارا گرینج ویلج"

○

گرینج ویلج بھی ایک دیکھنے کی چیز ہے--- شریف آدمیوں کے لئے تو صرف جاننے کی۔ اسے امریکہ کے مادر پدر آزاد طلباء طالبات نے آباد کیا تھا۔ آپ اسے بے حیائی کے شاہکار رومانٹک گاؤں کی حیثیت سے جان سکتے ہیں۔

اس گاؤں کا گرمائی میلہ جو سال میں ایک مرتبہ لگتا ہے البتہ دیکھا جاسکتا ہے۔ بس یوں جانئے جیسے ہمارے پنجاب کے روایتی میلے ہوتے ہیں جہاں فٹ پاتھ پر چٹپٹی چٹخارے دار کھانے پینے کی اشیاء اور نالے پراندے سے لے کر کنگھی شیشہ تک یہاں بکتا ہے۔ بالکل میلوں کے سے انداز میں۔

اس میلے کو اگر "سستی بیئر میلہ" کہا جائے تو زیادہ مناسب لگتا ہے---"

کیونکہ یہاں آنے والے مادر پدر آزاد خواتین و حضرات سستی بیئر کے ٹنوں پر شہد کی مکھیوں کی طرح جھپٹتے ہیں اور کئی کئی ٹن غٹاغٹ چڑھا جاتے ہیں جس کے بعد پھر وہ کچھ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جس کے متعلق بقول شاعر یہی کہا جاسکتا ہے کہ

ع آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

گرینج ویلیج کے جنوب میں مشہور زمانہ "وول ورتھ بلڈنگ" موجود ہے جسے شاپنگ سنٹر ہی کہا جائے گا لیکن یہاں دنیا کی کوئی ایسے شے نہیں جو نہ ملتی ہو مثلاً آپ نے ٹافی کھانی ہے تو وہ بھی موجود اور اگر پلنگ درکار ہے تو وہ بھی حاضر----

جو دل چاہے لیجئے۔

جتنا دل چاہے لیجئے۔

لیکن----

شرط یہی ہے کہ آپ کے پاس شاپنگ کے لئے رقم یعنی ڈالروں کی فراوانی ہونی چاہئے اس کے نزدیک ہی ویلیمز برگ برج ہے جو کوئینز سے شروع ہوتا اور ڈی لیسی سٹریٹ تک چلا جاتا ہے اس کے جنوب میں گرینڈ سٹریٹ۔

بروکلین اور مین ہٹن دونوں برج اس طرح تعمیر کئے گئے ہیں کہ بلندی سے دیکھنے پر ایک دوسرے کے بالکل متوازی نظر آتے ہیں---مین ہٹن برج کا خاتمہ نیویارک کے چائنا ٹاؤن پر ہوتا ہے----

اور وہ جسے آپ جناب جے الیف کے ایئرپورٹ سمجھ رہے تھے یہاں نہیں بلکہ بروک لین کے آخری سرے پر موجود ہے۔

بروک لین بیٹری ٹنل سے تو آپ گزر ہی چکے ہیں جو زیر آب تعمیر کیا گیا ہے اور جو سیدھا ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر جاتا ہے۔

طاہرہ اس دوران واپس آگئی تھی۔

"آؤ اب تمہیں ویسٹ سائیڈ بھی دکھا دوں کیا کہتے ہیں مغربی سمت تم بھی کیا یاد کرو گے کس سکھ سے پالا پڑا تھا"----

اب ہم بالکونی کی مغربی سمت میں کھڑے تھے۔ طاہرہ بچوں اور ہمارے لئے "وینڈنگ مشین" سے خاصا الم غلم نکال لائی تھی۔ روپ نے فوراً جوس کا ٹن کھولا اور دو تین سانسوں میں ہی غٹاغٹ چڑھا گیا۔

"یہ ہے مہاراج آر۔ ایچ۔ میسی اینڈ کمپنی جس کے "آؤٹ لٹ" سٹور سے آپ نے سیل میں پچھلی مرتبہ کوٹ خریدا تھا---یار! ساگر معلوم نہیں تم نے ابھی تک یہ شاپنگ پلازہ کیوں وزٹ نہیں کیا۔ حالانکہ جس طرح وہ کہتے ہیں ناں کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا کچھ نہیں دیکھا۔ اس طرح نیویارک آکر اگر کسی نے میسی نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا۔

یار! یہ دنیا کا سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹل سٹور ہے۔ کرسمس کے موقع پر "فلوٹ پریڈ" کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے----

"مجھے علم ہے انکل"---رابعہ کو پہلی مرتبہ اپنی معلومات جتانے کا موقعہ ملا تھا۔

"اس فلوٹ میں کرسمس بیلون، مکی ماؤس، پوپائے دی سیلر اور سیتا بھی ہوتے ہیں---"

"بالکل وہی گڈی۔ بالکل وہی"---روپ نے اس کے گال تھپتھپائے۔

امریکہ میں پریڈیں بہت ہوتی ہیں۔ یہاں نیویارک میں دو پریڈیں مشہور ہیں۔
پہلی کولمبس ڈے پریڈ جو امریکہ دریافت کرنے والے کولمبس کو یاد رکھنے کے لئے مناتے ہیں۔

دوسری اہم پریڈ یہاں کی "سینٹ پیٹریکس ڈے" نامی ایک مذہبی پریڈ ہے جسے اگر آئرش پریڈ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس میں زیادہ تعداد میں آئرش باشندے امریکہ کے کونے کونے سے آکر حصہ لیتے ہیں---

○

"بس کرو یار۔ نہ نیویارک کی عمارتیں ختم ہوں گی نہ تمہاری زبان رکے گی--- میں نے نیویارک کے جغرافیے کا امتحان نہیں دینا آؤ کچھ کھالیں"

میں نے روپ سے کہا کیونکہ اس درمیان رابعہ تین چار دفعہ مجھے احساس دلا چکی تھی کہ کھانے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ سے ہم نکلے اور مین ہٹن پر ایک پارکنگ میں کھڑی روپ کی کار لے کر بروک لین کی طرف آگئے---

بروک لین بھی اب لندن کا ساؤتھ ہال بنتا جارہا ہے۔

کچھ سٹریٹس تو یہاں پاکستانی اور ایشیائی ہوٹلوں ہی کے لئے مختص ہو کر رہ گئی تھیں

"شاہین میں چلیں---" مجھے ایک ہی نام یاد تھا---

"نہیں یار آج تمہیں ایک اور مسلمان بھائی کے ہوٹل میں لے جاتے ہیں"---

روپ نے کہا اور ہم پاکیزہ میں آگئے---!

چھوٹے سے تندرونما ہوٹل میں پھنسی پھنسائی چھ سات میزوں میں سے آدھی خالی تھیں۔

"گھبرا نہ جانا--- یہ دراصل ٹیک اے وے ہے جگہ کم ہونے کی وجہ سے لوگ

پیک کروا کر لے جاتے ہیں--- یہ میزیں تو تمہارے جیسے مسافروں کے لئے ہیں جو دوسرے شہروں سے یہاں آتے ہیں"---روپ نے کہا۔

"اچھا یار اب کچھ سوچنے بھی دو----"

طاہرہ اور بچے ایک بنچ پر اور روپ میرے ساتھ دوسرے بنچ پر بیٹھ گیا--- میں آرڈر پلیس کرنے کے لئے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے اس درمیانی عمر کے نوجوان کی طرف بڑھا جس کے کھڑے ہونے، بولنے اور دیکھنے کا انداز چغلی کھا رہا تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی حوالہ مجھ سے بھی بنتا ہے۔

اس کے سامنے شیشے کے کیس میں سجے کھانوں پر ایک نظر ڈالنے سے یوں لگتا تھا کہ ہم لاہور کے کسی تنور نما ریسٹورنٹ میں آگئے ہیں۔ ایسے ریسٹورنٹ جو اپنے ذائقہ کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں لیکن وہاں بیٹھنے کے لئے ڈھنگ کی جگہ نہیں ہوتی۔

میں نے حلال کھانے دیکھ کر اچھا خاصا آرڈر دے دیا۔

"سر جی! نیویارک ہی رہندے او---" اس نے پہلی مرتبہ ہمیں دیکھا تھا۔

"نہیں بھاجی--- فلاڈلفیا توں آئے آں---" میں نے کہا۔

تعارف کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں اندرون شہر لاہور کا رہنے والا ہوں تو اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ وہ لوہاری کے شیخ سویٹس والے شیخ صاحب کا بھائی ہے----

گو کہ یہ معمول کی بات تھی---

لیکن----

خدا شاہد ہے اس لمحے "پاکیزہ" کے شیخ صاحب کے چہرے پر جو زندگی چمکی تھی ہی زندگی کا امر لمحہ تھا۔

اپنے وطن، زمین اور ماحول سے آدمی کٹ جائے۔

کیسے ممکن ہے؟

جڑیں سوکھ جاتی ہیں۔

درخت جل جاتے ہیں۔

اپنی زمین سے کٹ کر جینے والے سات سمندر پار کے ان مکینوں کو اگر زندہ رکھا ہوا ہے تو رشتوں کے اس تقدس اور حوالے نے---

یہ لوگ وہ ہیں جو ہماری روایات کی طرح کھرے اور سچے ہیں یہ تو حوادث زمانہ ہیں جوان کو لاہور کی گلیوں سے اڑا کر نیویارک کی سٹریٹس پر لے آتے ہیں۔

ان کی اصلیت نہیں بدلی۔

امریکہ میں یہ پاکستانی پاکستان کا مان ہیں۔

جب بھی پاکستان پر قہر کی کوئی آندھی ٹوٹے۔

جب کشمیر پر غاصب بھارتیوں کی یلغار ہو----

یہ لوگ اپنا سب کچھ تج کر، سب کچھ چھوڑ کر۔ نیویارک کے کسی ایونیو کے سامنے یو این او کے سامنے۔ کسی پارک میں، کسی سٹریٹ پر سراپا احتجاج بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ان میں وہ بھی شامل ہیں جو پانچ چھ سال اپنے گھروں کو واپس نہیں لوٹے لیکن وہ بیقرار ہو جاتے ہیں۔

تڑپ اٹھتے ہیں۔

جب انہیں خبر ملتی ہے کہ پاکستان پر کوئی قیامت ٹوٹ گئی ہے۔

میں جانتا ہوں ان لوگوں نے زبردستی امریکہ سے اپنا رشتہ باندھا ہوا ہے۔

ایک روز کچے دھاگے کی طرح یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا اور پنچھی اپنے گھروں کو واپس لوٹ آئیں گے-----!!

شیخ صاحب کو میں نے جب بتایا کہ میرے سسرال ان کے محلے دار ہیں اور ان کا تعارف کروایا تو وہ بیقرار ہو کر کاؤنٹر سے باہر آئے اور مجھ سے بغل گیر ہو گئے---

میں نے بل زبردستی ادا کیا تھا کیونکہ وہ پیسے نہیں لے رہے تھے۔ یہ جھوٹا وعدہ کر کے میں نے انہیں پے منت کی تھی کہ میں اگلی مرتبہ ان کا مہمان بن کر آؤں گا--

شیخ صاحب نے بڑی بددلی سے بل وصول کیا تھا---!!

رات کے گیارہ بج رہے تھے ہم روپ سنگھ کے اپارٹمنٹ کی طرف رین بسیرا کرنے جا رہے تھے کیونکہ ہمیں اگلے روز یعنی اتوار کی دوپہر کو واپس جانا تھا---!!

روپ سنگھ نے ڈیش بورڈ پر رکھا کسیٹ ریکارڈر میں لگا دیا۔ کمال کی چوائس تھی--

روپ کی کار نیویارک کے براڈوے پر بھاگ رہی تھی اور اقبال بانو کی آواز دھیمے سروں میں رگ و پے میں اتر رہی تھی۔

دل کے دریا کو کس روز اتر جانا ہے۔

اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر آنا ہے

○

اگلے روز ہم نے سنٹرل پارک جانے کا پروگرام بنایا تھا----

میں تو پہلے بھی یہاں کی خاک چھان چکا تھا لیکن رابعہ بیٹی کے جذبات ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری تھا۔

سنٹرل پارک سے بڑے اسرار وابستہ ہیں----

آپ جس وقت بھی چلے جائیں آپ کو جاگنگ کرتے خواتین و حضرات ضرور دکھائی دیں گے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ امریکنوں پر جاگنگ کرنے کا جنون سوار رہتا ہے۔

دن ہو یا رات

صبح ہو یا شام۔

کسی بھی وقت آپ کو امریکہ کی کسی بھی سڑک اور پارک میں کوئی نہ کوئی امریکی جاگنگ کرتا ضرور نظر آئے گا۔

سنٹرل پارک سے بڑی کہانیاں جڑی ہیں۔ یہاں آئے روز کوئی نہ کوئی قتل ہوتا رہتا ہے---اس کے باوجود کہ گھڑ سوار پولیس کا گشت یہاں ۲۴ گھنٹے جاری رہتا ہے۔ لیکن----

آئے روز کسی نہ کسی ٹیکسی ڈرائیور کو لوٹنے کی واردات بھی ہوتی رہتی ہے۔

مہینے میں ایک آدھ مرتبہ کسی خاتون کو ریپ کرنے کے بعد قتل کر کے بھی یہاں پھینک دیا جاتا ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ راہ چلتے درختوں کے طویل سلسلوں میں کہیں کسی موڑ پر اچانک کوئی کالا چاقو لہراتا آپ کے سامنے آئے اور حکم دے گا۔

"پیسے نکالو"----

اب جان کی امان اسی صورت میں ملے گی جب آپ اس کو "ٹپ" دے دیں گے بصورت دیگر آپ کی جان بھی جا سکتی ہے اور مال تو جائے گا ہی----

امریکی اس معاملے میں بڑے عقلمند ہیں، اگر کہیں ایسا واقعہ پیش آجائے فوراً لٹیرے کی ڈیمانڈ پوری کر دیں گے کبھی اس کے سامنے ہیرو بننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ یہ جو ہم ہالی وڈ کی فلموں میں ویت نام سے لوٹنے والے فوجی کی کہانی دیکھا کرتے ہیں جو اکثر غنڈوں کے گروہوں سے ٹکرا جاتا ہے اور پھر ان کو ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔

خواتین و حضرات! کبھی ان فلموں سے متاثر ہو کر امریکہ کے لٹیرے کے سامنے ہیرو بننے کی کوشش نہ کریں۔

ہم نے تو خدا جھوٹ نہ بلوائے ویت نام کے ان ہیروز کو تین حالتوں ہی میں دیکھا ہے۔

(1) اپنی سابقہ وردی پہن کر امریکہ کے مختلف شہروں میں بھیک مانگتے۔

(2) واشنگٹن میموریل کے سامنے چندہ اکٹھے کرتے۔

(3) ویت نام ویٹرنز میموریل Vietnam Verternas Memorial واشنگٹن میں پتھروں پر گڑے ناموں پر ہاتھ پھیر کر یا ناموں کی ان تختیوں کے سامنے پھول رکھ کر روتے ہوئے۔

ہالی وڈ کی فلموں والے جیالے کم از کم مجھے کہیں دکھائی نہیں دیئے۔

○

سنٹرل پارک کے ایک خاصے آباد اور محفوظ کونے میں روپ، میں، طاہرہ اور بچے بیٹھے اس چائے سے دل بہلا رہے تھے جو طاہرہ روپ کے گھر سے اپنے ہاتھوں بنا کر لائی تھی----!!

ایک بوڑھا ٹھیلا گھسیٹتا ہماری طرف آ رہا تھا---!!

اس کے سر پر اس کے نحیف و نزار جسم سے زیادہ بھاری ہیٹ موجود تھا۔ لمبے کوٹ میلی کچیلی پتلون اور پھٹے ہوئے بوٹوں کے ساتھ وہ ٹھیلا گھسیٹتا سیدھا ہماری طرف آیا۔

ٹن بیئر سر!

ٹن بیئر میم--(میڈم)

اس نے بڑی پر امید نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

"نو---تھینک یو"---میں نے فوراً جواب دے دیا۔

"آئی ایم ساری، اولڈ گائی" روپ نے کف افسوس ملا۔

"جہنم میں جاؤ تم سب۔ گدھے۔ بد تہذیب۔ بے شعور جانے کہاں سے آجاتے ہیں یونائیٹڈ سٹیٹس میں"----

بوڑھا امریکی ہمیں مغلظات بکتا چلا گیا۔

حیرت کی بات تھی کہ روپ سنگھ کو غصہ نہیں آیا---

اس کے بعد تو مجھے بھی کبھی امریکنوں کی گالیوں پر غصہ نہیں آیا۔ کیونکہ گالی تو ان کمبختوں کی زبان پر دھرتی ہوتی ہے اور ایک خاص لفظ (فحاشی کے خوف سے لکھ نہیں سکتا) تو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے کہنے پر دس نیکیاں کما رہے ہوں----

مجھے طاہرہ نے بتایا کہ اگر امریکی پولیس والا آپ کو "ٹکٹ" دے۔ یعنی جرمانہ کر دے اور آپ کو غصہ آجائے تو بے دھڑک اسے بے نقط سناتے چلے جایئے وہ دانت نکالتا رہے گا یا چپ چاپ اپنی راہ لے گا۔

لیکن-----

ایک احتیاط ہمیشہ ملحوظ خاطر رہے کہ کبھی بھول کر بھی اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگانا ورنہ وہ درگت بنے گی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

امریکنوں کی بعض باتیں مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آسکیں---ایک تو یہ کم بخت Embaress بہت جلدی ہو جاتے ہیں----

ان کی Fealings فوراً Hurt ہونے لگتی ہیں۔

اور مہذب ترین امریکی بھی گالی دینا اپنا حق سمجھتا ہے۔

ان کے مزاج کے ذرا خلاف کچھ ہو جائے ٹھک سے گالی دے دیں گے---ہماری طرح کڑھتے نہیں۔

شاید اس معاشرے میں کڑھنے کا تصور ہی نہیں پایا جاتا۔

یہ لوگ فوراً اپنی بھڑاس نکال لیتے ہیں بھلے اپنے بیڈ روم کے گدوں پر نکالیں یا باورچی خانے پر----

لیکن کچھ ادھار نہیں رکھتے۔

فلاڈلفیا کی ساؤتھ سٹریٹ سے ہم "فرینکلن ملز" جا رہے تھے---

گاڑی حسب سابق طاہرہ چلا رہی تھی۔ طاہرہ کو امریکہ میں شاپنگ کی چمپئن کا اعزاز حاصل ہے۔ میرا خیال ہے جو چیز آپ کو امریکہ میں 10 تا 25 ڈالر کے درمیان ملتی ہے طاہرہ آپ کو ضرور کسی ایسے سٹور پر لے جائے گی جہاں یہی شے آپ کو صرف 5 ڈالر میں مل سکتی ہے۔

ساؤتھ سٹریٹ سے فرینکلن ملز کا فاصلہ قریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیو ہے----

میں پہلی مرتبہ ملز جا رہا تھا اور جب یہاں پہنچا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے خیال سے تو یہ کوئی کپڑے وغیرہ کی مل یا ان کا سیل ڈپو ہو گا۔

لیکن----

یہ تو دنیا کے بڑے شاپنگ پلازہ میں سے ایک تھا۔

داخلے کے لئے تین دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے داخل ہوں تو "جے سی پینی" کا بورڈ سامنے نظر آتا ہے۔

دوسرے دروازے سے داخل ہونے پر "میسی" نظر آئے گا۔ اور تیسرے دروازے پر داخل ہوں تو ٹوائز آر اس Toys-r-Us بچوں کا سٹور دکھائی دے گا--

ہم یہاں شاپنگ کرنے آئے تھے اور وہ بھی سستی شاپنگ----مجھے طاہرہ نے بتایا تھا کہ امریکہ کے جتنے بھی سٹور ہیں ان کے آؤٹ لٹ سٹور بھی ہوتے ہیں۔

ان آؤٹ لٹ سٹورز میں اس کمپنی کا مال فروخت ہوتا ہے لیکن بی کیٹگری میں-- ممکن ہے ان لوگوں نے اے اور بی کا کوئی فرق رکھا ہو لیکن مجھے تو نظر نہیں آیا-- بس وہ جسے ہم پنجابی میں "نخرہ" کہتے ہیں ایسی کوئی بات ضرور رہی ہو گی۔

امریکہ میں شاپنگ کا ڈھنگ آجائے تو کیا کہنے۔

لیکن----

عام حالت میں آپ پھر بمشکل ایک آدھ پتلون یا قمیص ہی خرید سکتے ہیں اگر آپ بہت امیر آدمی نہیں ہیں۔ اگر آپ کو خریداری کا طریقہ آجائے جیسا کہ میں نے طاہرہ سے سیکھا تو آپ کو پاکستانی بھاؤ پر اشیائے ضرورت یہاں سے مل سکتی ہیں۔

میں آپ کو "فرینکلن" کی مثال دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے بتایا اس مل کو آپ بے شمار سٹورز کا مجموعہ سمجھ لیجیے۔ ایک چھت کے نیچے امریکہ کے درجنوں سٹورز اکٹھے کر کے اس مجموعے کا فلاڈلفیا میں "فرینکلن ملز" رکھا گیا ہے۔

ہم "جے سی پینی" والے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے اندر جاتے ہی دائیں بازو پر آپ کو "پیزا پارلر" دکھائی دے گا۔

یہاں ایک لطیفہ سنادوں تو اسے دخل در نا معقولات نہ جانیے۔ امریکہ میں پیزا کھا کر اس کا ذائقہ منہ کو لگ گیا تھا۔

لاہور میں کبھی کبھی پیزا کھانے کو جی چاہتا تھا۔ اب ہم کوئی ایسے رئیس زادے تو ہیں نہیں کہ کسی فائیو سٹار میں اپنا شوق پورا کر سکتے۔ دوستوں نے ایک دو ٹھکانے لاہور میں بتائے کہ وہاں آزما دیکھو۔

لیکن----

کچھ خاص مزا نہ آیا بس نقل ہی کی گئی تھی۔

ایک روز میں بچوں کے ساتھ لاہور کے ایک بڑے ہی ماڈرن رہائشی علاقے میں

کسی کام سے گیا تھا کہ وہاں Piza Parler کا بورڈ دکھائی دیا۔

"وہ مارا" دل نے کہا۔

امریکہ میں "پیزا ہٹ" اور "پیزا پارلر" پیزے کے دو انتہائی معتبر نام ہیں یہاں لوگ بطور خاص پیزا کھانے جاتے ہیں۔

میں نے سمجھا کہ شاید نج کاری کے کسی پروگرام کے تحت یہاں بھی امریکنوں نے اپنی دکان کھول لی ہے۔

بچوں کے ساتھ مطلوبہ ریسٹورنٹ پہنچے بالکل امریکن ماحول، اسی انداز سے میزیں اور کرسیاں لگی ہیں--- اور سجاوٹ بھی اس طرح کی گئی ہے۔ خیر بیٹھنے پر بیرے نے ہمارے سامنے جو مینو رکھا--- اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ یہ پاکستان ہے تو میں حلفاً کہہ سکتا تھا کہ ہم امریکن پیزے، کی دکان پر بیٹھے ہیں۔

یقین کیجیے صد فی صد Piza Hut کی کاپی تھی۔ بالکل اسی انداز میں مختلف انداز سے پیزے اور خصوصی فرمائش پر خاص "ٹاپنگ" لکھی تھی

ہم نے دھڑلے سے آرڈر دے دیا۔

بچوں نے الگ سے کچھ منگوایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بیرے نے مطلوبہ آرڈر سامنے لا کر رکھ دیا۔ بچوں نے تو جیسے تیسے "ہیم برگر" کے نام پر آنے والے سلائس زہر مار کرنے شروع کر دیئے۔

اپنی بے وقوفی کا کچھ اندازہ تو یہ سٹف دیکھ کر ہو ہی گیا تھا لیکن ابھی کچھ کسر باقی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے بیرے سے پوچھا کہ حضور والا پیزا کہاں ہے۔

اس نے ادائے بے نیازی سے سٹیل کی پلیٹ میں رکھی بسکٹ نما چیز کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں نے کہا برادر میں نے "پیزا" منگوایا تھا۔

بیرے نے کہا جناب ہم کوئی چکن پیس نہیں لائے۔ پیزا ہی لائے ہیں۔

بحث بے کار تھی۔ دل پر پتھر رکھ کر بل ادا کیا اور اونچی دکان پھیکے پکوان کا ورد کرتے باہر آ گئے۔

دل نے کہا اگر امریکن "پیزا پارلر" والوں کو اس بات کا علم ہو کہ ان کے نام کی یہ درگت بن رہی ہے تو چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔

○

پیزا پارلر کے ساتھ ہی فاسٹ فوڈ کی مشہور کمپنیوں کے سٹال سجے تھے امریکن یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی جگہ آنے والا کوئی بھی شخص بھوکا، پیاسا ضرور ہو گا اس لئے ہر قابل ذکر جگہ پر آپ کو اس کا بندوبست نظر آئے گا۔

کسی شاپنگ سنٹر میں جایئے کپڑوں اور جوتیوں کی قطاروں سے گذر کر ایک کونے میں کوئی فاسٹ فوڈ کی دکان ضرور لگی ہو گی۔

ایک بات تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اتنے طویل و عریض سٹوروں کا ایک چکر لگا کر ہی آدمی کو بھوک یا پیاس ستانے لگتی ہے شاید اسی لئے اس کا انتظام کیا جاتا ہے۔

بات کچھ بھی رہی ہو۔ ایک بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ امریکہ کے کسی بھی کونے میں۔ کسی بھی سٹریٹ پر، پلازہ پر، ایونیو پر، آپ کو چار باتوں کے لئے کبھی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑے گی۔

باتھ روم کے لئے۔

سواری کے لئے۔

ٹیلی فون کے لئے۔

کھانے پینے کے لئے۔

ان چاروں معاملات میں امریکن ضرورت سے زیادہ خود کفیل ہو چکے ہیں اور

انسانی سہولیات میں نت نئے اضافے ہو رہے ہیں۔

ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے آپ کو کسی بھی قسم کی دقت پیش نہیں آ سکتی۔ کار خراب ہونے سے طبیعت خراب ہونے تک کے تمام مراحل سے آپ احسن طریقے سے نمٹ سکتے ہیں۔

○

فرینکلن ملز میں جس گیٹ سے ہم داخل ہوئے تھے وہاں داخل ہونے والے تمام لوگ چونکہ پہلے کھانے پینے کی اشیاء کی طرف بھی جاتے تھے سو ہم بھی ان کی تقلید میں ادھر ہی مڑ گئے۔ "سوڈے" کے نام پر برف کا گلاس ہاتھ میں تھام کر وہیں ایک کونے میں کرسی پر براجمان ہو گئے۔

امریکی سافٹ ڈرنکس کو "سوڈا" کہتے ہیں۔

یہاں شرفا کے لئے تین چیزیں ہوتی ہیں۔

سوڈا، جوس، کافی یا چائے۔

لیکن-----

سوڈے کی کتنی اقسام ہیں شاید کسی امریکی کو بھی ان کی تعداد یاد نہ ہو۔

ہمیں تو کوکا کولا، آر سی، پیپسی، سیون اپ، وغیرہ کا ہی علم تھا یہاں تو سینکڑوں ورائیٹیز موجود ہیں۔

لیمونیڈ سے جینجر ایل اے تک----- سینکڑوں اقسام کے سینکڑوں ذائقوں والے سوڈے موجود ہیں۔

اسی طرح جوس کو لیجئے۔

ٹماٹر کے جوس سے لے کر سنگترے کے اصلی جوس تک ہمہ اقسام کے جوس موجود ہیں۔

چائے بھی ہماری طرح نہیں۔ہاٹ، آئسڈ ٹی، لیمن ٹی اور نجانے کون کون سی ٹی۔

کافی البتہ ٹھنڈی اور گرم دو ہی قسم کی ہوتی ہے۔

اگر آپ تھوڑے سے "ترقی یافتہ" ہیں تو پھر ہمہ اقسام بیئرز موجود ہیں۔

اس سے آگے کا بیان ہمارے بس کی بات نہیں۔

○

طاہرہ پہلے فرینکلن مِل میں "ڈالر سٹور" پر لے گئی۔

"ارے واہ! وہ مارا"----میں نے دل ہی دل میں کہا۔

یہاں موجود ہر شے کی قیمت ایک ڈالر تھی۔گو کہ ایسے ایک دو سٹور میں نے اس سے پہلے اٹلانٹک سٹی میں بھی دیکھے تھے۔

لیکن----

اتنی بے تحاشہ ورائٹی وہاں موجود نہیں تھی۔یہاں تو بے شمار چوائس موجود تھی۔

میں نے بھی ندیدے بچوں کی طرح شاپنگ بیگ بھر لئے۔

بہر کیف میں تیسری دنیا کا باشندہ تھا۔

غیر ترقی یافتہ ملک کا رہنے والا۔

میں جانتا تھا جب واپس جاؤں گا، سب امریکہ کا تحفہ مانگیں گے تو مانگنے والا خالی ہاتھ کیوں جائے۔

الم غلم قسم کے پرفیوم، آفٹر شیو، سگریٹ لائیٹر امریکہ کی مہریں ہونی چاہئے امریکن پیکنگ ہی کافی ہے۔

وہاں کسی نے دیکھنا تھا اس کے اندر کیا بند ہے----

میں نے سوچا میں کہاں پندرہ پندرہ بیس بیس ڈالر کی قمیص خریدتا پھروں گا یہ ٹھیک ہے----

اور----

بلاشبہ یہ بڑا کامیاب تجربہ رہا----

طاہرہ تمہارا بے حد شکریہ----

"ڈالر سٹور" سے خریداری کرنے کے بعد جب ہم باہر نکلے تو میں نے سب سے پہلے سامنے کونے میں ستانے کے لئے رکھے دو بنچ سنبھال لئے اور تمام اشیاء پر سے قیمت کی سلپس اتار کر وہیں رکھے ڈبے میں "ٹریش" کر دیں۔

اب مجھے بالکل آزادی میسر تھی جس چیز کی جو قیمت چاہوں اپنے ذہن میں مقرر کر لوں۔

○

لاہور میں ہر سال صنعتی نمائش لگتی ہے۔

اس مرتبہ ہم بھی سارے گھر والے اکٹھے ہو کر چلے گئے۔

خریداری کیا کرنی تھی مقصد تو آؤٹنگ کرنا ہوتا ہے کہ چلو بچوں کی سیر بھی ہو جائے گی اور وہ اپنے ہم جماعتوں کے سامنے نمائش دیکھنے کے مسئلے پر سرخرو ہوں گے شرمندگی کا شکار ہونے سے بچ جائیں گے----

ماشاءاللہ یہاں سینکڑوں دکانیں سجی تھیں۔

لیکن----!

مسلسل پیدل چلنے سے بچوں کی تو کیا بڑوں کی بھی سانس پھولنے لگی تھی۔انتہائی سوس اور حیرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ساری نمائش گاہ میں کسی ایک سٹال پر تھکے ہوئے شائقین کے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی بھی موجود نہیں تھی۔

چھوٹی بیٹی اور ایک خاتون کو جب زیادہ تھک گئی تھیں ہم نے خدا خدا کر کے ایک تنوں کی دکان میں رکھی کرسیوں پر بٹھا دیا تاکہ خود آگے جا کر شاپنگ کر لیں اور

واپسی پر انہیں ساتھ لے لیں گے ----!

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد ایک دوسرے سٹال سے شاپنگ کر کے جب ہم واپس آئے تو میری بیٹی رونی صورت بنائے دکان کے باہر خاتون سمیت کھڑی تھی۔

"خیریت بھئی! اگر کھڑے ہونے کا شوق ہی چرایا تھا تو پیدل چلنے میں کیا مضائقہ تھا؟"

میں نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

"بیٹھے بیٹھے دل بھر آیا تھا۔ آپ یاد آنے لگے تھے اسی لئے اٹھ کر باہر آ گئے ---"

صاحبزادی نے روہانسی آواز میں کہا۔

"جناب آپ کے جانے کے تین چار منٹ بعد ہی دکان کے منتظمین میں سے ایک صاحب تشریف لائے اور ہمارے وہاں بیٹھنے کا سبب دریافت کیا۔ بیٹھنے کا جو جواز ہم نے پیش کیا وہ انہیں پسند نہیں آیا فرمانے لگے آپ باہر تشریف لے جائیں یہ تو ہمارے گاہکوں کے لئے ہے ---- تب سے اب تک ہم باہر کھڑے آنے جانے والوں پر حسرت کی نظر کر رہے تھے کہ کب آپ کا دل نمائش کی سیر سے بھرے اور ہم گاڑی تک پہنچ کر اپنی ٹانگیں سیدھی کریں ----" خاتون نے خود پر بیتنے والی قیامت کا احوال سناتے ہوئے کہا۔

میں نے بطور خاص اس بات کا جائزہ لیا کہ آخر کسی کونے میں تو بچوں، خواتین یا بزرگوں کے ستانے کے لئے بینچ، کرسیاں وغیرہ رکھی ہوں گی --- خدا خدا کر کے نمائش کے دروازے کے مین دروازے سے کچھ فاصلے پر تین چار بینچ نظر آئے جن پر چند مشٹنڈے اور کچھ پولیس ملازمین استراحت فرما رہے تھے۔

ہزاروں کی تعداد میں اس روز صنعتی نمائش میں بچے، بوڑھے، عورتیں اور جوان موجود تھے لیکن خدا کی پناہ منتظمین کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اس مسئلے پر بھی غور کرتے۔

اصل میں یہی وہ بظاہر چھوٹی چھوٹی لیکن اصل میں بہت بڑی بڑی باتیں ہیں جو کسی بھی قوم کی بنیادی اخلاقیات کو ظاہر کرتی ہیں۔

امریکہ میں آپ کوئی دکان نہیں بنا سکتے اگر اس میں گاہکوں کے لئے باتھ روم نہیں بنایا گیا ----

انتظامیہ کی اجازت کے بغیر ایک انچ جگہ آگے پیچھے نہیں کر سکتے ------

منیاری کی دکان کو پکوڑے بیچنے کی دکان نہیں بنا سکتے ----

ایک چولہا انتظامیہ کی اجازت کے بغیر نہ تو لگا سکتے ہیں نہ ہٹا سکتے ہیں ----

ٹھیک ہے ہم کبھی کبھی کسی چوراہے پر سیمنٹ کا ڈبہ بنا کر اس پر پتھر کی سل لگا کر پانی کا ثواب اپنے مرحوم والدین کی روح کو پہنچانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ چند روز بعد ہی وہاں نصب پانی کی ٹونٹیاں غائب ہو جاتی ہیں یا پھر پانی کی لائن ہی کاٹ دی جاتی ہے ----

لیکن ----

مہذب دنیا میں آپ کو قدم قدم پر تازہ، صاف پانی پینے کے لئے ملے گا دیگر سہولیات کا ذکر تو میں کر ہی چکا ہوں۔

○

صرف فرینکلن ملز دیکھنے کے لئے ہی سارا دن ناکافی ہے اور ہمارے پاس بمشکل تین چار گھنٹے تھے ----

دو تین مزید سٹوروں کی خاک چھاننے کے بعد ہم نے اپنے گھر کی راہ لی --- اگلے روز ویک اینڈ تھا۔

"ہم بچوں کے ساتھ پھر اس طرف چلے آئے اس مرتبہ طاہرہ نے گاڑی "ملز" کے بالکل سامنے "Care for" پر پارک کی تھی۔

فلاڈلفیا کا یہ بہت مشہور اور آپ کے تصور سے بڑا اسٹور ہے----!
پہننے کے کپڑوں سے لے کر کھانے کی اشیاء تک تمام ضروریات زندگی ایک چھت کے نیچے میسر ہیں۔

"میاں صاحب اور طاہرہ نے "گاڑی بھر" کر شاپنگ کی۔

جی ہاں! اس سے کم شاپنگ یہاں نہیں کی جا سکتی۔ یہاں خریداری کرنے والے "ہتھ ریڑھیاں" بھرتے اور اپنی گاڑیوں میں انڈیلتے چلے جاتے۔ پھر لدی پھندی گاڑیوں سمیت گھر پہنچ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں اگر کسی صاحب کی جوتوں کی دکان پر گاہک آنے لگیں تو سب سے پہلے وہ اپنی دکان پر اپنے سر کے عین اوپر ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں کر دیں گے۔ جس پر لکھا ہوتا ہے کہ

"خریدا ہوا مال تبدیل یا واپس نہیں ہوگا"

○

سیکورٹی والے معاملے کی طرح امریکن اس مسئلے پر بھی "عقل سے پیدل" نظر آتے ہیں انہوں نے تجارت کا کوئی سنہری اصول ہم سے مستعار نہیں لیا----

کم از کم مجھے امریکہ یا یورپ کے کسی شاپنگ سنٹر پر تجارت کا یہ سنہری اصول آویزاں نظر نہیں آیا۔

اس کے برعکس ان کی "بیوقوفی" ملاحظہ فرمائیے۔

آپ کسی بھی جگہ سے کوئی بھی چیز خرید لیں اور ایک مہینے کے اندر واپس کر دیں---صاحب! نہ تو کوئی آپ سے واپس کرنے کی وجہ دریافت کرے گا نہ کوئی حیل وحجت کرے گا بلکہ آپ کا اس طرح شکریہ ادا کرے گا جس طرح فروخت کرتے وقت ادا کیا تھا۔

"آپ کو اسی طرح Blessing کرے گا جس طرح آپ کی آمد پر کی تھی۔

مجھے اس بات کا علم یوں ہوا کہ میں نے بھی "کیئر فور" سے ایک پتلون خرید لی تھی۔ سائز تو اپنا لیا تھا لیکن جب گھر پہنچ کر پہن کر دیکھی تو ٹانگوں میں پھنسی تھی۔ میں نے طاہرہ سے ذکر کیا تو اس نے کہا کوئی بات نہیں۔

"کوئی بات کیسے نہیں---- میرے کسی عزیز کا میرے والا سائز نہیں کہ میں حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے پندرہ ڈالر کی پتلون اس کو تھما دوں---جب تک میرا بیٹا اسے پہننے کے قابل ہوگا تب تک اس کی یا میری گارنٹی ختم ہو چکی ہوگی اور عین ممکن ہے کہ فیشن بھی بدل چکا ہو۔"

میں نے عندیہ ظاہر کیا۔

"جناب یہ واپس کر دیں گے"--- طاہرہ نے اطمینان سے کہا---"ایک مہینے کے اندر اندر اگر رسید تمہارے پاس ہے تو ہم اسے بغیر وجہ بتائے واپس کر سکتے ہیں---"

اس کے بعد اس نے مجھے یہاں کے "اصول تجارت" سمجھانے شروع کر دیئے۔
چور کی داڑھی میں تنکا----

ہمیں بھلا کس طرح یقین آئے ہم نے تو ساری زندگی اپنے ملک میں اس کے برعکس اصول تجارت کارفرما دیکھا تھا۔

"لیکن میں نے تو اس پر موجود سارے گتے اکھاڑ کر پھینک دیئے ہیں۔" میں مکمل اطمینان چاہتا تھا۔

"پھر کیا ہوا بھئی---- استعمال تو نہیں کی ناں--- مطمئن رہو۔ اگلے ہفتے جائیں گے یا کوئی اور اس درمیان جائے گا تو واپس کر آئے گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"دل نہیں مانتا" میں بڑبڑایا۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ پرسوں میاں صاحب نے کچھ سامان خریدنے جانا ہے تم بھی چلنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا" طاہرہ نے جواب دیا۔

"واقعی صاحب! تین چار روز بعد ہم گئے سیدھے اس کاؤنٹر پر جہاں سامان واپس لوٹانے والوں کی قطار لگی تھی۔

ڈھلتی عمر کی ایک میم نے جسے بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی اس کی عمر انداز ہو سکتا تھا۔

مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ پتلون کا نمبر رسید کے نمبر سے ملایا اور پندرہ ڈالر اور ایک "واپسی کی رسید" مجھے تھما دی۔

"تھینک یو" ---- بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"یو ویل کم سر! You well come Sir اس نے لپ سٹک میں رنگے ہونٹوں پر مسکراہٹ جمائی اور اگلے گاہک کی طرف متوجہ ہو گئی۔

آپ امریکہ کے کسی بھی شاپنگ سنٹر سے کوئی چیز خریدیئے اور وہی چیز اگر ایک ماہ کے دوران کسی دوسری دکان پر آپ کی قیمت خرید سے زیادہ سستی ملے تو بلا جھجک پہلی دکان پر لوٹا کر یہاں سے سستی خرید لیجیے --- اللہ اللہ خیر صلا --- نہ کوئی لیتے ہوئے بھولے گا نہ دیتے ہوئے ---!

چند اشیاء مثلاً الیکٹرونکس کی کچھ چیزیں ایسی ضرور ہیں جن کی واپسی مشروط ہوتی ہے۔

○

فلاڈلفیا میں مجھے سب سے زیادہ پسند "K-Mart" نامی شاپنگ سٹور آتا ہے۔

کے مارٹ کو آپ اپنا جمعہ بازار سمجھ لیجیے۔

مجھے تو مغلوم نہیں وہ کون لوگ ہیں جو امریکہ میں مہنگائی کا رونا روتے ہیں۔ بس

آپ کو "فن خریداری" پر عبور ہو سب کچھ سستا مل جائے گا۔

کے مارٹ کا راستہ بھی پہلی مرتبہ ظاہر ہے طاہرہ نے ہی دکھایا تھا۔ ایک سہولت تو یہ تھی کہ اس سٹور کا فاصلہ طاہرہ کے گھر سے کچھ زیادہ نہیں تھا اور ہم بچوں کے ساتھ چہل قدمی کرتے وہاں پہنچ جاتے تھے۔

اب تو مجھے کے مارٹ کے سارے سیکشن حفظ ہو گئے ہیں۔ میں تو سیدھا سٹور میں گھستے ہی ان کونوں کھدروں میں پہنچ جاتا ہوں جہاں "سیل" لگی ہوتی ہے اور یہاں موجود اشیاء کی قیمت حیرت انگیز حد تک کم ہوتی ہے۔

اس کے بعد ہم اسی سے ملحقہ "پیتھ مارک" "ایکمن" اور پھر "مسیی" پر جاتے ہیں۔

طاہرہ کو علم ہے کہ "اصلی سیل" والا مال کس ٹوکرے میں پڑا ہے ---!

○

میں نے اسے ٹوکرا ہی کہوں گا۔

بالکل ایسا ٹوکرا جیسا تماشہ دکھانے والے مداریوں کے پاس ہوتا ہے اور جس میں سے وہ دوران تماشہ پھل فروٹ سے لے کر بندوق پستول تک ہر چیز برآمد کر کے دیکھا دیتے ہیں۔

طاہرہ کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔

اسے علم ہوتا ہے کہ کس کونے میں کوئی "ہتھ ریڑھی" سیل کے سامان سے بھری پڑی ہے۔ یہ سامان جس میں کپڑے، جوتے، خوشبو اور بچوں کے کھلونے تک موجود ہوتے ہیں اپنی دانست میں سٹور کے مالکان نے ناکارہ Out Of Fashion یا Out of Date یا آؤٹ آف سیزن سمجھ کر پھینکا ہوتا ہے۔

ان بڑے بڑے سٹوروں کا اصول ہے کہ کسی بھی قابل فروخت شے کی کوئی بھی ورائٹی بہت زیادہ وافر مقدار میں لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شرٹ جس پر ملکی ماڈس یا کسی الو

گدھے کی تصویر بنی ہے لاکھوں کی تعداد میں سیزن کے نزدیک خرید لیتے ہیں اور ملک بھر میں موجود اپنے تمام سٹورز پر پہنچا دیتے ہیں۔ اب سیزن میں تو اس کی قیمت چالیس ڈالر ہوتی ہے۔

لیکن----

اگلے سال کے آغاز یا اختتام پر امریکنوں کے مزاج کے مطابق یہ شرٹ ان کے ناک نہیں چڑھتی اور وہ اونے پونے داموں اسے ختم کرنے پر تل جاتے ہیں تاکہ اس کی جگہ سٹاک میں کوئی نیا ڈیزائن آ جائے۔ اس شرٹ کی فوراً سیل لگا دی جاتی ہے اور تیس چالیس ڈالر سے وہ دس پندرہ ڈالر کی ہو جاتی ہے۔

اب جناب ہوتا یہ ہے کہ فرض کیجئے دو تین ماہ تک سیل کے بعد بھی جو مال بچ جائے گا اسے یہ ان "طلسماتی ٹوکروں" میں پانچ ڈالر کا سٹکر لگا کر پھینک دیتے ہیں۔

آپ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ کہیں خدانخواستہ شرٹ کی اصلیت یا کوالٹی بدلی جاتی ہے امریکہ کے ان سٹوروں پر کبھی وہ چیز نہیں رکھی جاتی جس کی کوالٹی گھٹیا ہو۔ ایک دو سال نہیں پانچ دس سال بعد تک بھی "سٹف" خراب نہیں ہوتا۔ ہاں فیشن ضرور بدل جاتا ہے۔

لیکن----

یہاں بھی کمال کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں روزانہ فیشن بدلتا ہے اور کوئی فیشن نہیں ہوتا۔

میری اس بات کو یوں سمجھئے کہ اگر آپ امریکہ میں تازہ ترین فیشن کی پتلون پہن کر گھومیں تو کسی کی صحت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ایک شخص جو آپ کے مقابلے میں نیکر پہن کر گھوم رہا ہے جس نے کپڑے کی کترنوں سے تیار کردہ پاجامہ نما نیکر پہن رکھی ہے اس کے فیشن کو بھی آپ کے مقابل حیثیت حاصل ہے۔

○

اس ضمن میں ایک قصہ گوش گذار کرتا چلوں۔

فلاڈلفیا میں ننھے نمیر سے میری عینک گر گئی اور اس کا شیشہ تڑخ گیا۔

اس بری طرح تڑخا جیسے کبھی کبھی کار کی ونڈ سکرین تڑخا کرتی ہے اور اس پر یار لوگ نئی سکرین لگانے کے بجائے ٹیپ چپکا کر کام چلاتے ہیں۔

مجھے بڑی پریشانی ہوئی زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی غلطی ہوئی تھی کہ میں متبادل عینک نہیں لے کر گیا تھا۔

عام حالت میں دوران سفر میں ہمیشہ متبادل عینک پاس رکھا کرتا ہوں۔ اب کیا کیا جائے؟

طاہرہ مجھے براڈوے پر ایک عینکوں کی دکان پر لے آئی۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ اپنی عینک مارکیٹوں کی طرح پلک جھپکتے شیشہ بدل دیں گے۔

لیکن-----

بسا اوقات انسانی ضابطے خود انسان کے لئے بھی باعث اذیت بن جاتے ہیں جیسے کبھی کبھی بہت زیادہ سچ نقصان دہ ہو جایا کرتا ہے۔

میں نے اپنی باری آنے پر دکاندار صاحب سے کہا کہ عینک کا ایک شیشہ تبدیل کروانا ہے۔

"آپ کے پاس ڈاکٹری نسخہ ہے" اس نے سوال کیا۔

"برادر عزیز اس کی ضرورت کیا ہے۔ میں نے آنکھوں کی دوا نہیں لینی نہ ہی نظر چیک کروانی ہے آپ اپنے سامنے رکھی اس مشین میں میری عینک کو فٹ کر کے شیشے کا نمبر دیکھ لیں اور تڑخا ہوا شیشہ نکال کر نیا شیشہ فٹ کر کے چلتا کریں۔"

یہ تو بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے کبھی کبھی رات کو فلم دیکھ کر یا ہسپتال سے کسی

عزیز کی تیمار داری کے بعد لوٹنے والے خاوند صاحب کی موٹر سائیکل رُوک کر ہماری بہادر اور فرض شناس پولیس کے جوان پوچھا کرتے ہیں کہ پیچھے کس کو بٹھار کھا ہے۔

جب آپ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی زوجہ محترمہ ہیں تو اگلا سوال پُوچھا جاتا ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہاری بیوی ہے؟

آپ ٹپٹا کر یہی کہتے ہیں کہ میں نکاح نامہ تو جیب میں رکھ کر نہیں گھوم رہا۔

بالکل اسی طرح مجھے یہ تو علم نہیں تھا کہ امریکہ جاکر میری عینک کا شیشہ ٹوٹ جائے گا اس لئے اپنی نظر کا نسخہ بھی جیب میں رکھ کر گھوما کروں۔

گورے صاحب کے اس سوال نے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔

میں نے مزید کہا کہ جان عزیز میں پردیسی ہوں اور مجھے یہاں کے رولز اینڈ ریگولیشنز کا علم نہیں تھا پھر یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ بھی نہیں ہے ہمارے ملک میں تو چٹکی بجاتے ہی ایسے کام ہو جایا کرتے ہیں۔ مجھے کل نیویارک جانا ہے۔

اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ جناب والا اول تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں مشین میں نمبر چیک کر کے شیشہ لگادوں۔

نمبر دو یہ کہ آپ کو ہمارے ڈاکٹر صاحب سے نظر ٹیسٹ کروانی ہوگی اور اس نسخے پر ہی شیشے لگیں گے۔

اور سب سے آخری بات کہ بہت جلدی بھی کریں تو اس میں کم از کم چار دن لگیں گے۔

اس سے پہلے آپ کو اپائنٹمنٹ نہیں مل سکتی۔ ڈاکٹر صاحب بہت مصروف ہیں۔

"لعنت ہو تم پر۔ خدا کی مار" میں نے اپنی مادری زبان میں کہہ دیا۔

"کیا فرمایا؟" اس نے انگریزی میں مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں دراصل انہیں کل واپس جانا ہے۔" "تھینکس"

طاہرہ میرا ہاتھ پکڑ کر مسکراتی ہوئی باہر لے آئی۔

یہ تو تھی تمہید۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے واقعی دوسرے روز واشنگٹن کانگریس مین ڈین برٹن سے ملنا تھا۔

طاہرہ نے کہا کہ تین روز بعد لاہور سے اس کے ایک عزیز آرہے ہیں اپنے گھر فون کردو کہ وہ تمہاری عینک ان کو پہنچادیں۔ یہی سستا اور آسان ترین راستہ ہے یہاں کے میڈیکل قوانین بڑے پیچیدہ ہیں اور تمہیں تین چار روز سے پہلے عینک یوں بھی نہیں مل سکتی دو ڈھائی سو ڈالر بھی الگ اٹھ جائیں گے۔ جس میں اپنے ملک سے ایسی سو عینکیں خریدی جاسکتی ہیں۔

اس نے میری عینک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن مجھے تو؟

"تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ امریکہ میں بھلے تم ایک شیشے والی عینک کے ساتھ گھومتے پھرو کوئی تمہاری طرف دھیان سے دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرے گے۔"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے اسی کی ہدایت پر عمل کیا اور خواتین و حضرات یقین کیجئے کہ اس تڑخے شیشے والی عینک کے ساتھ میں امریکی کانگریس اور سینٹ میں گھومتا امریکی زعما سے ملاقاتیں کرتا رہا۔

کیا مجال جو کسی مرحلے پر مجھے احساس ہوا ہو کہ کوئی میری طرف غور سے دیکھ بھی رہا ہے؟

میں نے امریکہ کی بہت سی ائرلائنوں میں سفر کیا ہے ہم تو سوٹ بوٹ پہن کر اور نکٹائی باندھ کر گھٹے گھٹے اپنی سیٹ پر سمٹے سکڑے بیٹھے ہوتے ہیں۔

لیکن ۔۔۔۔

ہمارے سامنے خواتین کے ساتھ ساتھ حضرات مسافر بھی اتنے مختصر لباس میں تشریف فرما ہوتے ہیں کہ بیان کی طاقت نہیں۔

کیا مجال جو کوئی ان پر ہنسا ہو۔

کیا مجال جو کسی نے کبھی ہمارے سوٹ بوٹ کی وجہ سے ہماری عزت کی ہو۔

یہاں عزت کے معیار ہی الگ ہیں۔

یہاں کے "مینرز" ہی نیارے ہیں۔

یہاں لباس، رنگ، شکل و شباہت کچھ باعث عزت نہیں۔

اگر آپ بہت بدصورت ہیں لیکن آپ کے اندر خوبصورتی موجود ہے تو آپ قابل عزت ہیں۔

بصورت دیگر بھلے آپ شہزادہ "گلفام" ہوں یا ہر وقت مسکراتے رہنے والی اداکارہ آپ کتنے ہی خوش لباس ہوں مادیت پرست معاشرہ ہونے کے سبب اپنے مطلب کے لئے تو کوئی بادل نخواستہ چند لمحے کے لئے آپ کی عزت کرلے گا۔

عام حالات میں آپ کی شکل مبارک پر کوئی تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا۔

یہ اس کھوکھلی سوسائٹی کی باتیں ہیں۔

یہ وہ کافر ہیں۔ جن کے سامنے ہم ہر وقت کشکول پھیلائے بھکاریوں کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔

اب ذرا اپنی "اقدار" پر نظر دوڑا لیجئے۔

ہمارے ہاں انسانی شرف اور عزت کے معیار کیا ہیں؟ دیکھ لیجئے۔

ہمارے دعوے ملاحظہ فرمائیے۔

کس کے پیروکار کہلاتے ہیں ہم۔

اس نبی آخر الزمان ﷺ کے کہ جس نے عرب کے وحشیوں کو، انسان نما درندوں کو شرف انسانیت کے اس مرتبے پر بٹھا دیا کہ آج اپنے پرائے سارے عقیدت واحترام سے ان کا نام لیتے ہیں۔

ان کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

میں آپ کو خلفاً کہہ رہا ہوں کہ کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر نے جسے بظاہر کوئی Complex نہیں تھا میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے متعدد مرتبہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حوالہ دیا۔

صاحبو! بڑھکیں لگانے سے دنیا کو فتح نہیں کیا جاسکتا---!

اپنا گلہ ضرور خراب ہو جائے گا۔

دنیا کو مسخر کرنا ہے تو جس طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دلوں کو مسخر کیا۔ کیجئے

صرف تنقید کر دینے یا امریکہ کو کافر یا سامراج کہہ دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا---!

اسے مبالغہ نہ جانئے کہ جس امریکہ کو لعنت ملامت کرتے ہماری زبانیں نہیں تھکتیں اگر آج اس کے دروازے ہم پر مکمل کھل جائیں تو آدھا پاکستان امریکہ بھاگ جائے۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں ہم اپنی وفاداریاں پنی زمین سے زیادہ امریکی آقاؤں سے وابستہ کرنا اپنا اعزاز جانتے ہیں۔ اس تلخ حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے کرتا دھرتا خود کو میڈیا میں "ان" رکھنے کے لئے ریکن سرکاری عمال سے اپنی محبتوں کے جعلی قصے بھی پھیلاتے رہتے ہیں اور انہیں ش بھی کرواتے ہیں---

اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائیں۔ ہمارے عوام امریکہ جاتے ہیں "گرین کارڈ" نے اور ہمارے حاکمان امریکہ جاتے ہیں "گرین سگنل" لینے----!

طارق اسمٰعیل ساگر

لاہور